یکم دسمبر ۲۰۲۱ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۴ ـ شمارہ نمبر: ۲۲

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر:
سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ـ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ـ ۳۵، بلاک ـ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ـ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ـ۳۶۳۴۹۸۴۰ (۹۲ـ۲۱)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi. REG.No.SC-1303

۱ ـ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔
۲ ـ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔
۳ ـ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔
۴ ـ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔
۵ ـ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

عدم مساوات کے خلاف عالمی جنگ

Andrés Ortega

امریکا اور چین کو ایک ایسے مسئلے کا سامنا ہے جو دونوں ممالک کے درمیان مشترک ہے۔ یہ مسئلہ ہے اپنے اپنے معاشرے میں شدید نوعیت کی روز افزوں عدم مساوات کا۔ ویسے تو خیر دنیا بھر میں عدم مساوات پائی جاتی ہے اور بڑھ رہی ہے مگر دونوں بڑی طاقتیں اس معاملے میں زیادہ الجھنوں کا شکار ہیں۔ ایسا کسی نے سوچا نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اس طور واقع ہوگا۔ دونوں بڑی طاقتوں کی دو عشروں کی معاشی نمو سے توقع تھی کہ تمام ہی کشتیاں رواں رکھنے کی راہ ہموار ہوگی۔

امریکا اور چین میں تیزی سے پنپتے ہوئے متوسط طبقے کی بہبود یقینی بنانا جو بائیڈن اور شی جن پنگ کا ترجیحی ایجنڈا رہا ہے۔ دونوں کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ اُن کے سیاسی مفادات داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ دونوں ہی کو معاشرے میں عدم مساوات کا گراف نیچے لاکر پریشان حال لوگوں کو زیادہ سے زیادہ بہبود سے ہم کنار کرنا ہے۔ دونوں ممالک کے فرق کو بھی ذہن نشین رکھنا ہوگا۔ امریکا میں جمہوریت ہے یعنی ووٹ اہمیت رکھتے ہیں جبکہ چین میں آمریت ہے جہاں رائے عامہ کی اہمیت ہے۔ یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے کہ چین میں رائے عامہ کی کچھ وقعت ہے بھی یا نہیں۔ امریکی صدر متوسط طبقے کی بہبود کا نعرہ لگاتے ہیں جبکہ چینی صدر کے نزدیک پورے معاشرے کے مشترکہ مفاد کی زیادہ اہمیت ہے۔

صدر جو بائیڈن اور صدر شی جن پنگ بڑی فرمز (بالخصوص ہائی ٹیک) کو کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔ یہ معاملہ غیر معمولی حد تک سیاسی ہو چکا ہے۔ امریکا میں ہائی ٹیک ایریا یعنی سلیکون ویلی اب بھی ڈیموکریٹس کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔ اس کے باوجود کوشش کی جارہی ہے کہ قومی معیشت کے لیے شناخت کا درجہ رکھنے والے ادارے سیاسی معاملات پر اثر انداز نہ ہوں۔

مشکل یہ ہے کہ صدر بائیڈن اور صدر شی جن پنگ کی اپنی اپنی پالیسیوں کی پریسکرپشنز ایک دوسرے کے یکسر خلاف ہیں۔ جو بائیڈن چاہتے ہیں کہ مینوفیکچرنگ کی ملازمتیں گھر لائی جائیں۔ صدر شی جن پنگ چاہتے ہیں کہ اندرونِ ملک ملازمتیں پروان چڑھائی جائیں۔ عدم مساوات ختم کرنے کے جو بائیڈن کے ایجنڈے میں ''سب سے پہلے امریکا'' کا ڈونلڈ ٹرمپ کا لگایا ہوا نعرہ نمایاں ہے۔ ڈیڑھ دو عشروں کے دوران امریکا کی بہت سی ملازمتیں آؤٹ سروس کردی گئی تھیں یعنی دنیا بھر میں بیٹھے ہوئے تربیت یافتہ افراد امریکی اداروں کے لیے کام کر رہے تھے اور امریکیوں کو بے روزگاری کا سامنا تھا۔ اب امریکی صدر اس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ ان ملازمتوں کو واپس لایا جائے یعنی امریکیوں کے لیے روزگار کے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں۔

اپنے ملک کے لوگوں کو اولیت دینے کے لیے کیے جانے والے اقدامات کہیں نمایاں ہیں اور کہیں چھپے ہوئے۔ بائیڈن انتظامیہ امریکی تجارت اور سرمایہ کاری کو بھی تحفظ فراہم کرنا چاہتی ہے گوکہ بہت سے امریکی سرمایہ کار اس پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے۔ یہ متوسط طبقے کو ذہن میں رکھتے ہوئے تیار کی جانے والی خارجہ پالیسی کا حصہ ہے۔

عالمی سیاست و سفارت اور معیشت میں ایک دیرینہ سوال یہ ہے کہ امریکا اور چین میں متوسط طبقے کا فروغ ایک دوسرے کے لیے موزوں اور کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بھی عالمی سیاست میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ عالمی سیاست میں بھارت کے بعد امریکا اور چین ایسی سب سے بڑی معیشتیں ہیں جن میں سماجی عدم مساوات نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں جی انڈیکس بروئے کار لایا جاتا ہے، جس میں مکمل مساوات کے لیے صفر اور مکمل عدم مساوات کے لیے ایک ہوتا ہے۔ امریکا کا عمومی اسکور ۴۱ء۰، چین کا ۴۷ء۰، یورپی یونین کا ۳۸ء۰ اور او ای سی ڈی کا اسکور ۳۵ء۰ ہے۔ چین کی صورتِ حال آبادی میں معمر افراد کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باعث زیادہ پریشان کن ہے۔ پھر طبقاتی ڈھانچے کا معاملہ بھی ہے۔ معاملات اندر کی طرف پلٹ رہے ہیں اور یہ کیفیت ایسی ہے جیسے اہرام کو الٹ دیا جائے۔

۲۰۲۲ء کے موسمِ خزاں میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس سے قبل (جس میں وہ اپنے لیے ممکنہ طور پر

اندرونی صفحات پر:۔

- چین اور روس، برطانیہ کی قومی سلامتی کے لیے ممکنہ خطرہ ہیں
- ''مسلم صیہونیت'' ـ ایک نیا ابھرتا ہوا فتنہ!
- افغانستان: غلطیوں کے اعادے سے گریز
- بھارت چین تعلقات: ایک نیا تناظر
- آلودگی سے کراہتے سمندر
- مطلق العنانیت سے بڑھ کر کوئی وبا نہیں!
- اسلامی اساس پر علوم کی تدوینِ نو
- ہم کب تک ہیں؟

صدر کا تاحیات عہدہ چاہتے ہیں) شی جن پنگ نے مشترکہ خوش حالی کا نعرہ دیا ہے۔ وہ ممکنہ طور پر اعلیٰ سطح کی ملازمتوں کے لیے وقت کی وہ پابندی یا قید ختم کرنا چاہتے ہیں جو چیئرمین ماؤزے تنگ نے عائد کی تھی۔

شی جن پنگ کی ٹول کٹ میں بلند شرح والے ٹیکس، زائد آمدن والے شہریوں کی طرف سے قومی خزانے میں زائد عطیات، سماجی بہبود اور تعلیم کے پروگرامات کے لیے زیادہ فنڈنگ، بڑی نجی اجارہ داری کے خلاف سخت پابندیاں اور نئی ٹیکنالوجی تک آسان رسائی شامل ہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے کہ چین میں فلاحی ریاست کے تصور کو وسعت دی جارہی ہے یا نجی کمپنیوں کو قومی تحویل میں لینے کی تیاری کی جارہی ہے۔ شی جن پنگ کی سوچ چینی معاشی نظام میں ایک نئے مرحلے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اب کوئی چاہے تو اِسے ریاستی سرمایہ دارانہ نظام کہے یا پھر چینی خصوصیات کا حامل سوشلزم قرار دے۔ چینی صدر چاہتے ہیں کہ بڑے کاروباری ادارے اپنی مارکیٹ ویلیو میں تھوڑی کمی کر دیں۔ اس دوران شی جن پنگ ہاؤسنگ کے شعبے میں تھوڑی سی مہم جوئی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ پراپرٹی جائنٹ ایورگرینڈ کے ہاتھوں پیدا ہونے والے بحران کے غبارے سے ہوا نکالی جاسکے۔ ہاں، یہ بات اب تک واضح نہیں کہ معیشت کو نئی سمت دینے کی کوشش میں وہ بحران کس طور ٹالا جاسکے گا، جو امریکا اور اسپین سمیت کئی معیشتوں میں دس پندرہ برس کے دوران ابھرا ہے۔

صدر شی جن پنگ متوسط طبقے کو مضبوط تر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ طبقہ بھی کم و بیش ۴۰ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ وہ اس طبقے کی مجموعی آبادی ۲۰۳۵ء تک ۸۰ کروڑ کرنا چاہتے ہیں۔ جو بائیڈن نے کچھ ایسا ہی ہدف متعین کیا ہے۔ چین میں فرق صرف تعداد کا ہے۔ آسٹریلیا کے سابق وزیر اعظم کیون رڈ چینی اُمور پر خاصی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چینی صدر ایسی معاشی کیفیت چاہتے ہیں، جس میں لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ملے یعنی وہ ہاؤسنگ اور دوسرے اہم شعبوں میں اجارہ داری کو برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں۔ شی جن پنگ ہاؤسنگ سمیت کسی بھی شعبے میں سٹہ بازی کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ اُن کے نزدیک یہ سب کچھ محض فرضی معیشت ہے۔ مینوفیکچرنگ، ٹیکنالوجی اور بنیادی ڈھانچے جیسے حقیقی شعبوں میں سٹہ بازی کے خلاف جانے کی سوچ محض شی جن پنگ اور چینی کمیونسٹ پارٹی کی نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شی جن پنگ کے خیال میں حقیقی معیشت ہی چین کو ہر اعتبار سے عالمگیر برتری دلائے گی۔ یہ بنیادی سوچ ہی سیاست پر بھی اثر انداز ہوگی اور رواں صدی کے دوران امریکا اور چین کے درمیان ٹیکنالوجی کے شعبے میں برتری یقینی بنانے کی دوڑ میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کرے گی۔

چین میں حکومت نجی تعلیمی مراکز اور مختلف سطحوں پر پرائیویٹ کلاسز کے خلاف کریک ڈاؤن بھی کر رہی ہے۔ اس معاملے میں ''علی بابا'' کے مالک جیک ما کو بھی استثنیٰ حاصل نہیں۔ شی جنگ پنگ تعلیم کے شعبے کو قابو میں رکھ کر اُسے ایک خاص سوچ یا نظریے کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔

امریکی صدر بھی امریکا میں سماجی بہبود کے پروگرام کے تحت معیشت کا توازن بحال کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جو ہدف مقرر کیا تھا وہ اب گھٹا کر ۱۷۵۰ ارب ڈالر محدود کر دیا گیا ہے۔ اس میں مفت تعلیم کی بنیادیں وسیع کرنا، جامعات کے طلبہ کے لیے قرضے نرم بنانا اور چند ملازمین کے لیے کم از کم اجرت میں اضافہ شامل ہیں۔ یہ تمام اقدامات اب حقیقت سے دور دکھائی دے رہے ہیں۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ جو بائیڈن کا سماجی بہبود کا ایجنڈا ری پبلکنز کے حلق سے اتر نہیں رہا کیونکہ اس ایجنڈے کی کامیابی سے ڈیموکریٹس کی پوزیشن مستحکم ہوگی اور جو بائیڈن کے دوبارہ صدر منتخب ہونے کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ حیرت کی بات اگر ہے تو یہ کہ جو بائیڈن کو خود اُنہی کی پارٹی کے بعض سرکردہ ارکان کی مخالفت کا سامنا ہے۔

عدم مساوات کے خلاف لڑائی اب یورپ میں بھی اہمیت حاصل کرتی جارہی ہے۔ یہ لڑائی دراصل معاشی اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کا حصہ بھی ہے۔ اس کے نتیجے میں چالیس سال سے چلا آرہا دولت نواز رویہ کھٹائی میں پڑتا دکھائی دے رہا ہے۔

یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ امریکا اور چین کے صدور کا ایجنڈا ایک ہے لیکن اگر انہوں نے اس ایجنڈے کو کامیابی سے ہم کنار کرنے پر زیادہ توجہ دی تو ان کے درمیان مخاصمت بڑھ جائے گی۔ اس لڑائی میں اب تک تو چینی صدر کامیاب دکھائی دے رہے ہیں کیونکہ امریکی صدر کو محض سیاسی دشمنوں کی طرف سے مشکلات کا سامنا نہیں بلکہ ان کی اپنی سیاسی پارٹی کے لوگ بھی ان کے خلاف کھڑے ہیں۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Biden vs. Xi: The global battle for restoring domestic economic balance". ("theglobalist.com. November 3, 2021)

بقیہ: بھارت چین تعلقات: ایک نیا تناظر

تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بھارت کے پالیسی سازوں کو چاہیے وہ چین سے ٹکراؤ کے یورپی ایجنڈے کے لیے بھارتی کندھا استعمال نہ ہونے دیں۔ چین کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ اور اسے عالمی طاقت بننے سے روکنے کی ذمے داری امریکا پر عائد ہوتی ہے۔ بھارت کی جغرافیائی و سیاسی ترجیحات، اس کی سرحدی سلامتی، برصغیر اور مغرب کے بعد کے کثیر قطبی عالمی نظام کی تشکیل کے مقابلے میں بہت محدود ہیں۔

یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ بھارت کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ امریکا اور چین کی تزویراتی مسابقت غیر متوقع رخ بھی اختیار کر سکتی ہے، مثلاً ضروری نہیں کہ یہ مسابقت اور رقابت کسی تنازع کی صورت ہی اختیار کرے، بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت یہ دونوں طاقتیں اپنی اس مسابقت کو معاونت میں بدل دیں اور اپنا اپنا اثر ورسوخ قائم رکھنے کے لیے چند مشترکہ مفادات اور ترجیحات پر متفق ہو جائیں۔ ایسی صورت میں بھارت کہاں کھڑا ہوگا؟ اس لیے کسی دوسرے ملک کے مفادات کے لیے کسی سے بھی غیر ضروری دشمنی مول لینا کہاں کی عقل مندی ہے۔

مزید یہ کہ کئی دہائیوں کے باہمی انحصار کو آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ کانگریس میں موجود سرمایہ دار اور کاروباری افراد چین کے ساتھ ۲۰۰ ارب ڈالر کے تجارتی تعلقات کو اتنی آسانی سے ختم نہیں ہونے دیں گے۔ اس تجارت میں ۳۳ فیصد کی شرح سے اضافہ ہوا ہے۔ اور نہ ہی دنیا کی بڑی بڑی سپلائی چین کمپنیاں چاہیں گی کہ چین کے ساتھ تعلقات کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔

۲۰۲۰ء کی دہائی ایک ایسی دہائی ہے، جہاں بھارت کو چاہیے کہ وہ اپنی پالیسیوں پر نظرِ ثانی کرے، بھارت نہ صرف چین بلکہ دیگر چھوٹی ترقی پذیر معیشتیں جنہوں نے معیاری حکمرانی اور ملک میں سماجی و اقتصادی استحکام فراہم کیا ہے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کو ترجیح دے۔ اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر چین سے تعلقات کو آگے بڑھائے، جس شعبے میں چین کے ساتھ باہمی تعاون سے آگے بڑھا جاسکتا ہے وہاں کسی داخلی سیاست یا دیگر ممالک کے مفادات کو سامنے رکھ کر پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے، اور جہاں باہمی مسائل ہوں وہاں بھی ان کی شدت کو اتنا رکھا جانا چاہیے کہ واپسی کا راستہ کھلا رہے۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"India needs a new playbook on China. Here's why". ("rt.com". Nov. 21, 2021)

چین اور روس، برطانیہ کی قومی سلامتی کے لیے ممکنہ خطرہ ہیں

برطانوی خفیہ ایجنسی MI-6 کے سربراہ رچرڈ مور کی گفتگو

جارج بوئڈن اور فرینک گارڈنر

برطانوی خفیہ ایجنسی ایم آئی سکس کے سربراہ کا کہنا ہے کہ چین اور روس برطانیہ کے لیے خطرہ ہیں اور کابل پر طالبان کا قبضہ 'انٹیلی جنس ناکامی' نہیں تھا۔

برطانوی خفیہ ایجنسی ایم آئی سکس کے سربراہ رچرڈ مور جنہیں 'سی' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، 'بی بی سی ریڈیو فور' سے بات کرتے ہوئے کہا کہ چین کے قرض اور ڈیٹا کے جال سے ملک کی خودمختاری و قومی سلامتی کو ممکنہ خطرہ ہے اور اس سلسلے میں دفاعی اقدامات کیے گئے ہیں۔

گذشتہ برس اکتوبر میں اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد وہ انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ فار اسٹریٹیجک اسٹڈیز (آئی آئی ایس ایس) میں منگل کو اپنے پہلے خطاب میں برطانوی خفیہ ایجنسی ایم آئی سکس کو ڈیجیٹل دور میں پیش آنے والے مسائل کا ذکر کررہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اپنے کام کے بارے میں کھل کر بات کرنے کا فیصلہ آج کی جدید جمہوریت میں بہت اہم ہے۔

انہوں نے چین کے دیگر ممالک کو دیے جانے والے قرضوں اور ڈیٹا تک حصول کو جال قرار دیتے ہوئے دنیا کے امن کے لیے خطرہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے چین کے حوالے سے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ چین کے پاس 'دنیا بھر سے ڈیٹا حاصل کرنے کی صلاحیت ہے' اور وہ اس کام کے لیے 'لوگوں کو پیسے (قرض) دے کر اپنے جال میں پھنساتا ہے'۔

ان کا کہنا تھا کہ چین 'اپنی اقتصادی پالیسیوں کے ذریعے کسی ملک پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے اور میرے خیال میں کبھی کبھار لوگ اس کے شکنجے میں آجاتے ہیں'۔

انہوں نے چین کی جانب سے ڈیٹا کے جال پر بات کرتے ہوئے کہا کہ 'اگر آپ کسی اور ملک کو اپنے معاشرے کے حساس ڈیٹا تک رسائی دے دو گے تو وقت کے ساتھ وہ آپ کی خودمختاری و قومی سلامتی کو ختم کردے گا کیونکہ تب آپ کا اس ڈیٹا پر سے کنٹرول ختم ہو جائے گا'۔ ان کا کہنا تھا کہ 'برطانیہ اس سے متعلق بہت آگاہ ہے اور ہم نے اس کے دفاع کے لیے اقدامات کرلیے ہیں'۔

انہوں نے اپنے انٹرویو میں روس اور یوکرین کے 'دیرینہ مسئلے' پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ سے روس برطانیہ کے لیے بھی خطرہ 'بن سکتا ہے'۔

انہوں نے روس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ مغربی ممالک کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ روس کی جانب سے سالسبری کو زہر دینے اور بلقان کے استحکام کو خراب کرنے کے لیے سیاسی پشت پناہی جیسے ریاستی اقدامات کے خلاف آواز اٹھائیں۔

برطانوی خفیہ ایجنسی ایم آئی سکس کے سربراہ نے اپنے انٹرویو میں مختلف موضوعات پر بات کرتے ہوئے افغانستان پر طالبان کے قبضے کے متعلق بھی تسلیم کیا کہ طالبان کی پیش قدمی کے متعلق ان کے اندازے غلط تھے، تاہم کابل پر طالبان کا قبضہ انٹیلی جنس ناکامی نہیں تھی۔

ان کا کہنا تھا کہ 'کابل کے اس قدر تیز قبضے کی کسی نے پیشگوئی نہیں کی تھی'۔ ان کا کہنا تھا کہ 'اگر ہم طالبان شوریٰ کے ہر ایک رکن کو بھی بطور خفیہ ایجنٹ بھرتی کر لیتے تب بھی ہم کابل پر اس قدر جلد قبضہ کی پیشگوئی نہ کرسکتے تھے کیونکہ طالبان کو بھی اس کا علم نہیں تھا'۔

برطانیہ کے خفیہ ادارے ایم آئی سکس کے سربراہ کے مطابق ان کے ادارے کو اپنے خفیہ کام کو اچھی طرح سرانجام دینے کے لیے اپنے آپ کو پردے سے باہر لانا ہوگا۔

ایم آئی سکس کے سربراہ رچرڈ مور کا کہنا ہے کہ مصنوعی ذہانت، کوانٹم کمپیوٹنگ اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے مل کر خفیہ معلومات کے حصول کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ بائیومیٹرک ڈیٹا اور چہروں کو پہچاننے کی ٹیکنالوجی نے اب خفیہ ادارے کے اہلکاروں کے لیے مشکل بنا دیا ہے کہ وہ اپنی شناخت کو چھپا کر اور خود کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنا کام سرانجام دے سکیں۔

گذشتہ برس ستمبر میں اس بات کا انکشاف کیا گیا تھا کہ لندن میں ایم آئی سکس کے ہیڈ کوارٹر میں ایک کیو سیکشن ہے جہاں برطانیہ کے جاسوسوں کو محفوظ اور مخفی رکھنے کے لیے نئے نئے آلات سے متعارف کروائے جاتے ہیں۔

رچرڈ مور جو ایم آئی سکس میں ۳۴ برس سے کام کررہے ہیں، نے حاضرین کو بتایا کہ ایم آئی سکس کو اوپن کرنے کے علاوہ نئی ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے پرائیوٹ سیکٹر کے ساتھ شراکت داری کرنا ہوگی۔ وہ کہتے ہیں کہ کوانٹم انجینئرنگ اور بائیولوجی مل کر تمام صنعتوں کو بدل کر رکھ دیں گے۔

ٹیکنالوجی میں ہونے والی ترقی ریاستی عناصر اور بین الملکی دہشت گرد گروپوں جیسے بُرے کرداروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ انہیں تنخواہ خطروں کو بھانپنے کے عوض ملتی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ ایم آئی سکس ایک ایسی دنیا میں کام کرتی ہیں جیسی حقیقت میں دنیا ہے، نہ کہ ایسی دنیا جسے ہم دیکھنا تو چاہتے ہیں لیکن وہ موجود نہیں ہے۔ اور ٹیکنالوجی کی انقلابی ایجادات ایم آئی سکس کو اس پر انتہائی سخت توجہ کا تقاضا کرتی ہے۔

برطانیہ کی قومی سلامتی کو لاحق خطرات

رچرڈ مور نے مغربی انٹیلی جنس دنیا کے لیے چار بڑی ترجیحات میں چین، روس، ایران اور عالمی دہشت گردی کو شمار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے مخالفین مصنوعی ذہانت، کوانٹم کمپیوٹنگ اور سینتھٹک بائیولوجی پر مہارت حاصل کرنے کے لیے دولت کا بے دریغ استعمال کر رہے ہیں، جس سے انہیں فائدہ ملے گا۔

برطانیہ کی تین انٹیلی جنس ایجنسیوں، ایم آئی سکس، ایم آئی فائیو اور جی سی ایچ کیو کے فرائض میں ملکی سلامتی کے لیے بیرون ملک اپنے رابطوں سے خفیہ معلومات اکٹھی کرنا ہے۔

ایم آئی سکس جو اپنا زیادہ تر کام پرانے طریقہ کار کو بروئے کار لا کر کرتی ہے، اس کے سربراہ نے کچھ ایسی ایجادات کا ذکر کیا، جس میں ایم آئی سکس کا کردار ہے۔ مثال کے طور پر دوسری جنگ عظیم کے دوران خفیہ تحریروں کی تخلیق میں ایم آئی سکس کی کاوشیں شامل تھیں جو بعد میں وائرلیس اور محفوظ پیغام کی شکل میں سامنے آئیں۔

وہ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں ایم آئی سکس برطانیہ کی یونیفائیڈ سائبر کمانڈ کے بانی اراکین میں شامل ہے، جس کے ذریعے دہشت گردوں، مجرموں اور دیگر خطرات کو روکا جاتا ہے اور آپریشنز میں فوج کو مدد فراہم کی جاتی ہے۔

ایم آئی سکس کے سربراہ کی یہ تقریر شاید ادارے کی طرف سے دیر سے کیا جانے والا ایسا اعتراف ہے کہ اگر ایم آئی سکس چوکس نہ رہی تو وہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں اپنے حریفوں سے پیچھے رہ جائے گی۔

ان کا کہنا ہے: 'ہم گلوبل ٹیکنالوجی کی نقل بنانے کی امید

باقی صفحہ نمبر ۱۰

''مسلم صیہونیت'' ۔ ایک نیا ابھرتا ہوا فتنہ!

رضی الدین سید

قارئین کے لیے ''عیسائی صیہونیت'' یا ''کرسچن زائنزم'' کی اصطلاح وقت کی تبدیلی کے ساتھ اب نئی نہ رہی ہوگی۔ کم ازکم امریکا میں تو یہ بہت تیزی کے ساتھ پھیل ہی چکی ہے۔ یہ ایک جدید پھیلتا ہوا نظریہ ہے جس پر خود معروف امریکی مصنفہ گریس ہال سیل، اپنی کتاب ''فورسنگ گاڈس ہینڈس'' (''خوفناک جدید صلیبی جنگ'') میں بہت عرصے قبل ہی حیران کن تفصیلی انکشافات کرچکی ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ آج کے دور میں کل کے ''یہودیوں کے خون کے پیاسے عیسائی'' اب آگے بڑھ کر ان سے بھی زیادہ یہود دوست ہوگئے ہیں اور پورا فلسطینی علاقہ یہودیوں کو دینے کے حق میں مسلسل عالمی دباؤ ڈال رہے ہیں جو چوطرفہ بھی ہے۔ ایک طرف وہ اپنے امریکی عیسائیوں کو متاثر کررہے ہیں تو دوسری طرف کانگریس، سینیٹ، امریکی صدور اور مسلم حکومتوں تک کو دباؤ میں لارہے ہیں۔ مصنفہ کے کیے گئے انکشافات وہ ہیں جن سے ہماری تمام مسلم حکومتوں کے کان بہت زیادہ کھڑے ہونے چاہئیں۔ لیکن افسوس کہ کسی بھی مسلم حکمران طبقے کو مطالعے اور غور وفکر سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔ دنیا کے بدلتے ہوئے سنگین حالات اور مسلمانوں کے خلاف تابڑتوڑ مسلط کی جانے والی جنگوں کی اصل وجوہات دریافت کرنے سے وہ بالکل ہی انجان بنے بیٹھے ہیں۔

امریکا میں مسلمانوں کا ایک جدید تحقیقی ادارہ بنام ''اسلاموفوبیا اسٹڈیز سینٹر'' کے نام سے برکلے، کیلی فورنیا میں کام کررہا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو وہ اپنی تحقیقات سے مسلسل چوکنا اور آگاہ کررہا ہے کہ غیر مسلم عیسائی و یہودی قوتیں مسلمانوں کے خلاف عرصۂ دراز سے بہت دورس، بہت تیز اور بہت گہری سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس لیے ہر سمت اور ہر حکومت سے انہیں بہت محتاط و چوکنا رہنا ہوگا۔ کیونکہ ان کا ناپاک ارادہ یہی ہے کہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے یکسر مٹادیا جائے۔ ادارے نے بہت دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے کہ انہی گہری سازشوں کے باعث بڑھتی ہوئی عیسائی صیہونیت کے ساتھ اب ایک نئی صیہونیت مزید اُبھر کے سامنے آرہی ہے جس کا نام حیرت انگیز طور پر ان قوتوں نے ''مسلم صیہونیت'' رکھا ہے۔ اس کا آغاز فی الحال مشرق وسطیٰ سے ہوا ہے جب تمام مسلم عرب خطے، ماسوائے ایک دو کے، خونی وسیاسی یہودیوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کے ساتھ انہوں نیا سید یگر سہولیات بھی عطا کی ہیں۔ افسوس ناک طور پر اس نئے دائرے میں شامل ہونے کے لیے پاکستان بھی وقتاً فوقتاً پر پُرزے نکالتا رہتا ہے جس کے لیے فیلرس چھوڑے جاتے ہیں تاکہ رائے عامہ کی ذہن سازی کی جاسکے۔ مسلمان اور صیہونیت کے ہمدرد؟ ۔ سنتے ہی بہت عجیب سا لگتا ہے، لیکن حقیقت یہی ہے۔ ہمارے سامنے یہ صیہونیت مسلسل مصروفِ عمل ہے۔ صیہونیت کے پھیلاؤ کی خاطر یہودیوں کے ساتھ مسلمان بھی اب ان کا ساتھ دیں گے، ہزاروں برس سے موجود مسلم فلسطینیوں کو قتل کریں گے، اور قبلۂ اول بیت المقدس کو شہید کرکے ان کے ہزار سال قبل مسمار شدہ ہیکل کی تعمیر میں مدد دیں گے۔

مذکورہ تحقیقاتی ادارے نے بتایا ہے کہ جنگِ عظیم اول کے بعد جب خلافت عثمانیہ کی بندر بانٹ ہوہی تھی، تو یروشلم کو برطانیہ کے زیرانتظام دے دیا گیا تھا۔ بے تحاشا بمباری ہورہی تھی اور شہر کے مقدس مقامات کا تحفظ مشکل ہوتا جارہا تھا۔ شہر کا چارج لینے والا برطانوی کمانڈر جنرل ''ایڈمنڈ ایلن بی'' یروشلم شہر میں پیدل داخل ہوا اور برسرعام اعلان کیا کہ ''آج جاکر صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہوا ہے''۔ اس دور کے وزیراعظم برطانیہ ''لائیڈ جارج'' نے یہی بات دہرائی کہ ''آج کے دن برطانوی شہریوں کے لیے یروشلم کی فتح، کرسمس کا ایک بڑا تحفہ ہے''۔ واضح رہے کہ یہ ۱۶/اور ۱۷دسمبر ۱۹۱۷ء کی بات ہے۔ دوسری طرف ایک اور برطانوی اخبار نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے دشمن رچرڈ شیر دل کی تصویر لگائی، جو صیہون کی پہاڑی سے نیچے یروشلم شہر کو جھانک رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ''میرا خواب آج پورا ہوگیا''۔ ادھر برطانوی فوج نے بھی انہی الفاظ کے ایک خفیہ میمو کا اجرا کیا تھا۔ لیکن بعد میں اس سے یہ الفاظ حذف کردیے گئے تھے، کیونکہ برطانوی افواج میں ایک بڑی تعداد مسلم سپاہیوں اور افسران کی بھی خدمات انجام دے رہی تھی اور برطانیہ کو خدشہ ہوا کہ کہیں ان الفاظ سے فوج میں بے چینی نہ پیدا ہوجائے۔ دوسری طرف گورنر مکہ شریف ہاشمی کو بھی برطانیہ ترکوں کے خلاف جنگ کے لیے مالی امداد دے رہا تھا۔ چنانچہ اسے اس کی جانب سے بھی عدم تعاون کے خطرے کا ادراک ہوا۔ انہی دنوں برطانوی وزارتِ اطلاعات نے یہ بھی انکشاف کیا تھا کہ جن دو کمانڈروں نے ترکی کے اس ''سرینڈر'' میں حصہ لیا تھا، وہ دراصل سابقہ ''نائٹس'' (knights) کی اولاد میں سے ہیں۔ یاد رہے کہ سابقہ دور میں صلیبی شعلے بھڑکانے میں نائیٹس سب سے آگے آگے تھے۔

یاد رہے کہ یہ فتح سیکولر سے زیادہ مذہبی تھی۔ (اسلام کے خلاف مغرب کی جتنی بھی جنگیں لڑی جاتی رہی ہیں یا اب لڑی جارہی ہیں، ان کے بارے میں کبھی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ وہ لامذہبی تھیں یا اب وہ مذہبی جذبوں سے تائب ہوچکے ہیں)۔ سو سارا یورپ یروشلم کی اس فتح سے خوش تھا اور یہودیوں کو مکمل تعاون دے رہا تھا، تاکہ وہ یہاں ٹیمپل یا صومعہ بناسکیں۔ عیسائیوں کا منشا یہ تھا کہ نیا ٹیمپل بنے تب ہی ان کے نبی عیسیٰؑ کی جلد آمد ممکن ہو۔ برطانوی حکومت نے بھی ۱۹۱۷ء میں کنعان سرحدیں بائبل کی روشنی میں طے کردی تھیں۔

عرب ممالک میں اسرائیل کی قربتیں بہت آگے بڑھ گئی ہیں۔ سفارت خانے کھل گئے ہیں، اسرائیلی جہاز ان کے ہاں اترنے لگے ہیں، یہودیوں کے ''کوشر'' ریسٹورنٹس کھل گئے ہیں، سینما اور اسٹیج کنسرٹس رواج پاگئے ہیں۔ ایک سعودی عرب ہی باقی رہ گیا ہے جو حرمین شریفین کی موجودگی کے باعث بہت کھل کر آگے بڑھنے سے رُکتا ہے۔ ورنہ عملاً تو وہ بھی اسرائیل کو قبول کرچکا ہے۔ یہ وہ حکومتیں ہیں جو اَب سے پچھتر سال پیچھے تک اسرائیل کو مسلسل غاصب اور جارح قرار دیتی تھیں۔ ان کے آبائی حکمرانوں کی تقریریں اسرائیل کے خلاف آج بھی موجود ہیں۔ مصر نے تمام عرب ممالک کی مخالفت کے باوجود ۱۹۷۷ء میں جب اسرائیل کو تسلیم کیا تھا تو عرب ممالک میں اتنی غیرت تھی کہ سب نے مل کر مصر کا بائیکاٹ کیا تھا اور وہ عرصۂ دراز تک عرب دنیا سے کٹا رہا تھا۔ یہی عرب ممالک تھے جہاں یاسر عرفات کی تنظیم اور حماس کے قائدین بھی اپنے دفاتر رکھا کرتے تھے۔ لیکن فضا اب الٹ کر یکسر اسرائیلیوں کے حق میں چلی گئی ہے۔ اسرائیل اب ان کا دوست قرار پایا ہے، جبکہ مزاحمتی تحریک حماس مجرم ٹھہری ہے۔ یہی عرب مسلم ممالک اب یہودیوں کی خاطر ''مسلم صیہونیت'' کو بڑھ چڑھ کر فروغ دیں گے، ویسے ہی جیسے

باقی صفحہ نمبر ۱۶

افغانستان: غلطیوں کے اعادے سے گریز

William Dalrymple

'' یہ جنگ کسی دانش مندانہ مقصد کے بغیر شروع کی گئی تھی، فضول سفاکی اور خوف کے امتزاج کے ساتھ جاری رکھی گئی، خاصے جانی و مالی نقصان کے بعد خاتمے کی طرف لائی گئی، جس حکومت نے اِس جنگ کو شروع کیا تھا اُس کے لیے یہ ذرا بھی شان وشوکت وافتخار کا ذریعہ نہ بنی اور جس فوج نے یہ جنگ لڑی اُس کے لیے بھی اس میں کچھ ایسا نہ تھا جس پر فخر کیا جاسکتا۔ اس جنگ سے کوئی ایک واضح سیاسی یا عسکری فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکا۔ ہمارا انخلا بھی ویسا ہی تھا جیسا کسی شکست خوردہ فوج کا ہوا کرتا ہے''۔

یہ الفاظ ۲۰۲۱ء میں نہیں بلکہ ۱۸۴۳ء میں لکھے گئے تھے۔ لکھنے والے تھے ریورینڈ جی آر گلیگ اور ان الفاظ کو ضبطِ تحریر میں لانے کا بنیادی مقصد ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۲ء کے درمیان افغانستان سے برطانیہ کی خاصی مہنگی اور ایسی جنگ کو بیان کرنا تھا، جس کا کوئی جواز نہ تھا اور جس سے گریز بھی کیا جاسکتا تھا۔ برطانوی افواج اور افغانستان کے درمیان پہلی جنگ بجا طور پر مشرق میں کسی مغربی طاقت کی سب سے بڑی عسکری ہزیمت تھی۔ اس کے بعد اگر کوئی بڑی اور واضح شرمندگی ہوئی ہے تو ۱۹۴۲ء میں جاپانی افواج کے سامنے برطانوی افواج کی بڑے پیمانے پر ہتھیار ڈالنے سے ہوئی۔

۶ جنوری ۱۸۴۲ء کو کابل سے شروع ہونے والی بدنامِ زمانہ پسپائی کے بعد ۱۸۵۰۰ سپاہیوں میں سے صرف اسسٹنٹ سرجن ڈاکٹر ولیم برائیڈن ۶ دن بعد جلال آباد پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس فوج میں ۹۰ فیصد بھارتی سپاہی تھے جن میں اکثریت بہار اور اتر پردیش کے برہمنوں اور راج پوتوں کی تھی۔ وہ یا تو مار دیے گئے یا پھر غلام بنا لیے گئے۔

اُس زمانے کی دو تصویریں بہت مشہور ہوئیں۔ ایک میں چند برطانوی سپاہی قبائلیوں کے نرغے میں کھڑے ہیں اور دوسری میں ڈاکٹر برائیڈن جلال آباد پہنچنے پر شہر کی فصیل کے پاس نڈھال کھڑے ہیں۔ ان دونوں تصویروں کو دیکھ کر لوگوں کو یقین نہ آیا کہ تب دنیا کی سب سے طاقتور سمجھی جانے والی فوج جدید اسلحے اور دیگر وسائل سے محروم قبائلیوں کے ہاتھوں مار کھا بیٹھی ہے۔

ایک زمانے تک کابل سے پسپائی نے مغربی طاقتوں کو اس خطے میں کسی بھی نوعیت کی عسکری مہم جوئی سے باز رکھا۔ تیس سال بعد افغانستان سے برطانوی افواج کی دوسری جنگ سے کچھ پہلے جارج لارنس نے لکھا ''ایک نئی نسل پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے جو اپنے ماضی سے کوئی سبق سیکھنے کے بجائے ہمیں ایک ہنگامہ پرور اور ناخوش ملک کے معاملات میں الجھا دینے کے درپے ہے۔ بڑے پیمانے کے عسکری نقصان سے ہم بچنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں مگر یہ ڈر ہے کہ اگر کوئی چھوٹی موٹی معرکہ آرائی اس وقت کامیاب ہو بھی جائے تو وہ آگے چل کر سیاسی اعتبار سے انتہائی فضول سرگرمی ثابت ہو کر رہے گی۔ برطانوی افواج کو ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۲ء کے دوران جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ ہمارے سیاست دانوں کے لیے ایک معیاری انتباہ ہے کہ اس ملک سے خواہ مخواہ الجھنے سے باز رہیں۔

اکتوبر ۱۹۶۳ء میں ہیرولڈ میکملن نے وزارتِ عظمیٰ ایلک ڈگلس ہوم کو سونپتے ہوئے ممکنہ طور پر یہی مشورہ دیا تھا کہ جب تک افغانستان پر لشکر کشی سے مجتنب رہو گے تب تک تمہارے معاملات درست رہیں گے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جان میجر نے یہ مشورہ ٹونی بلیئر کو نہیں دیا تھا۔ نائن الیون کے فوراً بعد ٹونی بلیئر نے امریکی صدر جارج واکر بش کے ساتھ افغانستان پر حملے کی دستاویز پر دستخط کیے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اُس نے آلڈس ہکسلے کے مقبول ترین الفاظ کو ایک بار پھر درست ثابت کردیا...... تاریخ سے آپ صرف یہ سیکھتے ہیں کہ کوئی بھی تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتا!

افغانستان سے برطانیہ کی چوتھی جنگ بہت حد تک پہلی جنگ کاری پلے تھی۔ دونوں جنگوں کے درمیان بہت کچھ ملتا جلتا رہا اور یہ محض اتفاق نہ تھا بلکہ ٹھوس حقیقت پر مبنی تھا۔ وہی قبائلی رقابتیں اور وہی جنگیں ۱۶۰ سال بعد اُسی خطے میں لڑی گئیں۔ فرق صرف پرچموں کی تبدیلی کا تھا۔ کچھ نئے سیاسی نظریات تھے اور ہاں، سیاسی کٹھ پتلیاں نچانے والے بھی نئے تھے۔

اس بار بھی حملہ آوروں نے سوچا کہ وہ ''مفتوحہ'' ملک میں آزادانہ گھوم پھر سکیں گے، نئی حکومت لانے میں کامیاب ہوں گے اور پھر صرف دو سال میں وہاں سے سامان باندھ لیں گے۔ اس بار بھی مغربی فوجی خود کو ایک بہت بڑے تنازع میں الجھنے سے روکنے میں ناکام رہے۔

افغانستان سے پہلی برطانوی جنگ مسخ خفیہ معلومات کی بنیاد پر لڑی گئی اور یہ ایک ایسے خطرے کی بنیاد پر لڑی گئی جو تھا ہی نہیں۔ ایک روسی ایلچی کابل گیا تو معاملے کو بڑھا چڑھا کر ہندوستان کے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیا گیا۔ جنگی جنون میں مبتلا چند افراد نے اس معاملے کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے خوب استعمال کیا۔ روسی حملے کا مفروضہ گھڑ کر برطانوی حکومت پر زور دیا گیا کہ افغانستان پر جلد از جلد حملہ کردیا جائے۔ روسی حملے کے خوف میں مبتلا برطانوی سفیر جان میکنیل نے تہران سے لکھا ''ہمیں یہ اعلان کردینا چاہیے کہ جو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ ہمارے خلاف ہے۔ ہمیں ہر حال میں افغانستان کو بچانا ہے''۔ اور یوں ایک ایسی مہنگی، شدید نقصان دہ جنگ شروع ہوئی جو ہمارے لیے آج بھی ایک مثال بن کر کھڑی ہے۔ یہ ایسی جنگ تھی جسے لڑنے سے مکمل طور پر گریز کیا جاسکتا تھا۔

حامد کرزئی کا تعلق پوپل زئی قبیلے سے تھا۔ ۱۸۳۹ء میں برطانیہ نے جس کٹھ پتلی حکمران کو افغانستان پر مسلط کرنا چاہا تھا وہ یعنی شاہ شجاع الملک بھی پوپل زئی تھا۔ ان کے سب سے بڑے حریف غلزئی جو افغانستان کی پیادہ فوج میں اکثریت میں تھے۔ طالبان کے سربراہ ملا عمر مجاہد بھی ہوتکی غلزئی قبیلے کے سربراہ تھے۔ ۱۸۴۱ء میں برطانوی فوج کو خون میں نہلانے والی مزاحمتی قوت کا سربراہ محمد شاہ خان بھی غلزئی قبیلے سے تھا۔ خود طالبان بھی اس نوعیت کی مماثلت کا اکثر تذکرہ کرتے ہیں۔ اقتدار میں آنے کے بعد ایک پریس ریلیز میں انہوں نے لکھا ''سبھی جانتے ہیں کہ کس طرح کرزئی کو کابل لایا گیا اور کس طرح اُسے وہ حکومت سونپی گئی جس کا دفاع شاہ شجاع بھی نہیں کرسکا تھا''۔

ہوسکتا ہے کہ مغرب نے یہ تاریخ بھلا دی ہو مگر غیر ملکیوں کی حکومت کو کسی بھی حالت میں قبول نہ کرنے والے افغانوں نے یہ تاریخ کبھی فراموش نہیں کی۔ شاہ شجاع آج بھی افغانستان میں غداری کی نمایاں علامت ہے۔ ۲۰۰۱ء میں طالبان نے اپنے نوجوانوں سے پوچھا تھا کہ آپ لوگ شاہ شجاع کی حیثیت سے یاد رکھا جانا پسند کریں گے یا پھر دوست محمد خان کی حیثیت سے۔

ملا عمر نے اپنے آپ کو دوست محمد کے طور پر پیش کیا۔ قندھار میں رکھے ہوئے نبی اکرم محمدؐ کے ملبوس کو نکال کر ملا عمر نے پہنا اور اپنے آپ کو امیر المومنین کہلوانا پسند کیا۔ بہت جلد افغانوں کی اکثریت سمجھ گئی کہ ملا عمر اُنہیں ۱۸۴۲ء میں برطانوی فوج کو دی جانے والی شکست یاد دلانا چاہتے ہیں۔

اب افغانستان میں اتنی غربت ہے کہ افغانوں پر ٹیکس عائد کرکے ان پر قبضے کو برقرار رکھنے کی لاگت وصول نہیں کی جاسکتی۔ ایسے میں قابضین کے اپنے وسائل پر افغانستان میں پولسنگ کی لاگت کے حوالے سے دباؤ بہت زیادہ ہے۔ بیس برس میں امریکا نے افغانستان میں ہر سال کم و بیش ۱۰۰ ارب ڈالر خرچ کیے ہیں۔ افغان صوبے ہلمند کے دو اضلاع میں امریکی میرینز کو تعینات رکھنے پر جو کچھ خرچ ہوا ہے، وہ مصر کی پوری قوم پر سالانہ عسکری و معاشی امداد کی مد میں خرچ کی جانے والی رقم سے زیادہ ہے۔ بات ۱۸۴۲ء کی ہو یا ۲۰۲۱ء کی، دونوں جنگوں میں فوج کو واپس بلانے کے فیصلے کا افغانستان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک طرف تو قابضین کی معیشت ڈانوا ڈول تھی اور دوسری طرف اندرونِ ملک سیاسی خرابی بہت بڑھ گئی تھی اور فوج کو واپس بلانا ناگزیر ہوگیا تھا۔

ان دو جنگوں کے درمیان جو کچھ بھی مماثل تھا اُس سے اگر کوئی سب سے زیادہ واقف تھا تو وہ سابق افغان صدر حامد کرزئی تھے۔ میں نے جب برطانیہ اور افغانستان کے درمیان پہلی جنگ کے بارے میں کتاب ''ریٹرن آف اے کنگ: دی بیٹل فار افغانستان'' شائع کی تھی تب انہوں نے مجھے کابل بلا کر کئی عشائیوں پر مشتمل نشستوں میں ان دونوں جنگوں کی تفصیلات کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے تاریخ سے سیکھے جانے والے سبق پر بھی بات کی تھی۔

ان کا خیال تھا کہ امریکی اُن (حامد کرزئی) کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہیں جو برطانوی حکمرانوں نے ۱۷۰ سال قبل شاہ شجاع کے ساتھ کیا تھا۔ ''لارڈ آکلینڈ نے دوست محمد خان سے کہا تھا کہ ہم تمہارے ملک میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے۔ یہ جھوٹ تھا۔ آج امریکی اور دیگر مغربی اقوام یہی کہہ رہے ہیں۔ امریکیوں کو افغانوں نے جو موقع فراہم کیا تھا اُسے انہوں نے ضائع کر دیا ہے''۔

حامد کرزئی نے واضح کر دیا کہ شاہ شجاع نے ملک کی آزادی و خودمختاری پر زیادہ زور نہیں دیا تھا مگر وہ (حامد کرزئی) ایسا نہیں کریں گے۔ وہ نہیں چاہیں گے کہ انہیں محض کٹھ پتلی کے طور پر یاد رکھا جائے۔ ''ریٹرن آف اے کنگ'' پوری توجہ سے پڑھنے کے بعد حامد کرزئی نے اپنی پالیسیوں میں موزوں تبدیلیاں کیں اور اس بات کو یقینی بنایا کہ جو غلطیاں شاہ شجاع نے کی تھیں اُن کا اعادہ نہ ہو۔ وکی لیکس میں ہلیری کلنٹن کی ایک ای میل بھی منظرِ عام پر آئی جس میں انہوں نے حامد کرزئی کے عہدِ صدارت میں امریکا اور افغانستان کے سردمہری پر مبنی تعلقات کے لیے حامد کرزئی کے اس کتاب کے مطالعے کو بھی ذمہ دار قرار دیا۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ حامد کرزئی کے جانشین اشرف غنی نے تاریخ سے کوئی سبق سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی حالانکہ وہ معروف ماہر بشریات ہیں۔ ان میں حامد کرزئی جیسی سفارتی مہارت نہیں تھی اور اپنی حکومت کی مکمل ناکامی کی ذمہ داری کا سب سے زیادہ بوجھ اُنہی کو برداشت کرنا چاہیے۔

اشرف غنی کی بے صبری، درشت مزاجی اور خودسری نے بہت سے قبائلی سرداروں کو متنفر کر دیا اور اشرف غنی میں وہ کشش اور نرمی نہ تھی جو حامد کرزئی کا خاصہ تھی۔ اور اسی چیز نے حامد کرزئی کو مقبولیت فراہم کی۔ اشرف غنی ملک کے دور افتادہ علاقوں سے آنے والے قبائلی عمائدین سے ملاقات کے وقت کہتے کہ اُن کے پاس صرف دس منٹ ہیں۔ پھر وہ اپنے جوتے اتار کر ایک بلند اسٹول پر بیٹھتے اور اپنے پیر اُن عمائدین کی طرف کرتے جو انتہائی اہانت آمیز عمل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بعد میں چند ایک ہی قبائلی سردار تھے جو اشرف غنی کا اقتدار بچانے کے لیے کوئی قربانی دینے پر راضی ہوئے۔

پہلی افغان جنگ نے ملک کو بہت حد تک مثبت اثرات کا حامل بنایا۔ ۱۸۴۲ء میں اقتدار میں واپسی پر امیر دوست محمد نے برطانوی دور کی اصلاحات کو اپنایا۔ اس سے افغانستان کو مضبوط تر بنانے میں مدد ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ شجاع اور اُس کے بہت سے ہم عصروں نے لفظ افغانستان استعمال نہیں کیا۔ ان کے نزدیک معاملہ کابل کی امارت یا بادشاہت کا تھا۔ یہ دُرانی سلطنت کا بچا کھچا حصہ تھا اور خُراسان کے سرے پر واقع تھا۔ پھر ایک نسل کے بعد ہی اندرون و بیرونِ ملک نقشوں پر لفظ افغانستان دکھائی دینے لگا اور اس سرزمین کے باشندے بھی خود کو افغان کہنے میں فخر محسوس کرنے لگے۔

برطانوی حکمرانوں نے شاہ شجاع کو فرماں روا کی حیثیت سے بحال کرنے کی کوشش کی، جو نوآبادیاتی قوت کی طرف سے آخری ناکام کوشش ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی درانی سلطنت کی باقیات کی حیثیت سے سدوزئی خاندان کی بادشاہت بھی ختم ہوگئی۔ پہلی افغان جنگ نے موجودہ افغانستان کی حدود کے تعین کی راہ ہموار کی اور یوں افغانستان ایک باضابطہ ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر اجاگر ہوا۔

پہلی افغان جنگ نے تو افغانستان کو مستحکم کر دیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ حال ہی میں ختم ہونے والی جنگ کیا افغانستان کی موت کا سبب بنے گی۔ بیس برس میں افغانستان اس قدر بدل گیا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ شہر پھیل گئے ہیں۔ لوگ سفر زیادہ کرنے لگے ہیں۔ ہزاروں خواتین تعلیم پا چکی ہیں۔ ٹی وی، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے ذہن کھول دیے ہیں۔

تھوڑی بہت مزاحمت بھی موجود ہے مگر اس کے باوجود یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ طالبان کے بحال شدہ اقتدار میں منقسم افغانستان مجموعی طور پر کس نوعیت کے مستقبل کا حامل ہوگا۔ ایسے میں ۱۸۴۲ء میں افغان مؤرخ مرزا عطا کے الفاظ آج بھی زندہ ہیں ''امارتِ خراسان پر حملہ کرنا یا اُس پر حکومت کرنا کسی بھی اعتبار سے آسان نہیں''۔

افغانستان میں مضبوط مرکزی اتھارٹی والی حکومتیں کم ہی رہی ہیں۔ ایسے لمحات کم ہی آئے ہیں جب پورے ملک کے قبائلی عمائدین نے کابل میں بیٹھے ہوئے حکمران کو مکمل طور پر قبول کیا ہو۔ جامع اور متحدہ سیاسی نظام کے حامل لمحات اور بھی کم رہے ہیں۔ افغانستان ایک باضابطہ ملک کی حیثیت کا حامل کبھی کبھار ہی رہا ہے۔ ملک بھر میں قبائلی عمائدین کی قیادت میں قائم علاقے ہیں جو مل کر ملک تشکیل دیتے ہیں۔ یہ قبائلی عمائدین ملک یا وکیل کہلاتے ہیں اور ان کی وفاداری خالص ذاتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اُن سے یا تو بات کرنا پڑتی ہے یا پھر لڑائی کے ذریعے اُنہیں مطیع و فرماں بردار بنانا پڑتا ہے۔

قبائلی روایات ہمیشہ اشرافیہ کی مرضی کے تابع رہی ہیں اور اگر کبھی کسی کے ماتحت کام کرنا بھی پڑے تو ایسا اپنی شرائط کے تحت ہوتا ہے۔ مالی منفعت ہی اتحاد و اشتراکِ عمل کی طرف راغب کرتی ہے۔ اس پر بھی وفاداری کے تسلسل کی کوئی ضمانت فراہم نہیں کی جاسکتی۔ کسی بھی قبیلے کا سپاہی کابل کے شاہ کے بجائے اپنے قبیلے کے سردار کا وفادار ہوتا ہے کیونکہ وہی اُسے گزر بسر کے لیے تنخواہ یا اجرت دیتا ہے۔

افغانستان میں قبائلی نظام عجیب نوعیت کا ہے۔ غیر مشروط اور مکمل وفاداری کی ضمانت کسی بھی طور نہیں دی جاسکتی۔ قبیلے کی اپنی اتھارٹی بھی سراب کی سی ہے۔ ہر شخص خود کو خان سمجھتا ہے۔ ایسی دنیا میں ریاست کبھی حقیقی قوت کی حامل نہیں ہوتی۔ افغانستان میں بادشاہ کانٹوں کے بستر پر سوتا ہے۔ جو کچھ کابل میں ہوتا رہا ہے، وہ قبائل کی زندگی پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہاں کم ہی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور لوگوں کی عمومی زندگی میں زیادہ خلل واقع نہیں ہوتا۔

اب طالبان کو بھی اسی مسئلے کا سامنا ہے۔ طالبان اپنی عسکری قوت کو مرکزی حکومت میں تبدیل کر رہے ہیں تو طالبان کے دو

باقی صفحہ نمبر ۱۰

بھارت چین تعلقات: ایک نیا تناظر

Dr. Zorawar Daulet Singh

چین کے ساتھ مقابلہ کرنے اور بھارت کی حدود میں اس کی بڑھتی ہوئی جارحیت کے خلاف مزاحمت کے دوران، نئی دہلی کو طاقت کے توازن اور تاریخ کے اسباق سے آگاہ رہنا چاہیے۔

حالیہ مہینوں میں، امریکی پالیسی سازوں نے چین کے ساتھ امریکی تعلقات کے حوالے تبدیل ہوتی ہوئی حکمت عملی کے لیے ''ذمہ دارانہ مسابقت'' یا ''ذمہ دارانہ مقابلے بازی'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ۱۶ نومبر کو ہونے والے ورچوئل سمٹ کے دوران، امریکی صدر بائیڈن اور چینی صدر شی جن پنگ نے ذمہ داری کے ساتھ مسابقت کرنے پر زور دیا۔ بائیڈن نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہمیں تزویراتی مفادات کو بھی احسن طریقے سے ہینڈل کرنا ہوگا۔ اور معاملات کو اس طرح سے آگے لے کر بڑھنا ہوگا کہ مسابقت تنازع کی شکل اختیار نہ کرے اور آپس میں رابطے ہر صورت میں برقرار رہیں۔

چین کے عروج سے نمٹنے کے لیے بھارت کو بھی نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ گزشتہ ایک دہائی سے یہ بات کی جا رہی ہے کہ بھارت کو اپنی ہچکچاہٹ ختم کر کے چین کے خلاف بننے والے سکیورٹی اتحاد کا حصہ بننا چاہیے اور اس میں فعال کردار ادا کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو سکا ہے اور نہ ہی مستقبل میں ہو سکے گا، اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ بھارت کو چین سے جو خطرات درپیش ہیں وہ اتحاد میں موجود بقیہ ممالک سے بالکل مختلف ہیں۔ مختلف جغرافیائی پوزیشن اور جیو اسٹریٹجک ترجیحات میں تضادات کی وجہ سے اتحاد ایک جیسے اہداف رکھنے سے قاصر ہے۔ چین کے خلاف نیٹو جیسے اتحاد بنانا تقریباً ناممکن ہے، کیوں کہ اس میں شامل ممالک کی سلامتی کی ترجیحات میں ہمیشہ اختلافات رہیں گے، اور بین الاقوامی بحران کی صورت میں ہم آہنگی بھی نہ ہو سکے گی۔

مزید برآں، کسی بھی اتحادی یا نیم اتحادی فریم ورک کا مطلب ہے کہ بھارت اپنی آزاد جغرافیائی سیاسی شناخت اور مستقبل میں ایک عظیم طاقت ہونے کا دعویٰ ترک کر دے۔ اگرچہ ہم یہ سنتے رہتے ہیں کہ بھارت بدل گیا ہے، لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ بھارت کے لیے محض اپنی بنیادی شناخت کو ترک کرنا کتنا آسان یا فائدہ مند ہوگا، جو کہ ناگزیر ہے۔ اگر بھارت امریکی قیادت والے اتحاد کو قبول کرتا ہے تو اس بارے میں حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آیا بھارت کثیر قطبی دنیا میں ذہانت کے ساتھ اپنی شناخت برقرار رکھ سکے گا یا نہیں یا موجودہ دنیا میں ایک مستحکم اور خوشحال خطے میں، ایک ایسے عالمی نظام کے ساتھ ملنا جو بہت سے لوگوں کے لیے کام کرتا ہے نہ کہ مخصوص طاقتوں کے لیے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ گزشتہ ۱۰۰ برسوں میں بلاک پر مبنی اتحاد استحکام لانے کے بجائے تنازعات کا باعث بنے ہیں، جبکہ گلوبل دنیا میں اتحاد ایک مختلف صورت حال سامنے لا رہے ہیں۔

آج، حریف طاقتوں کے درمیان صرف تزویراتی استحکام ہی باہمی مفاد نہیں ہے، بلکہ ایک پائیدار عالمگیر معیشت کا ازسرنو حصول، انسانی ترقی اور انسانی سلامتی کو فروغ دینا، موسمیاتی تبدیلی اور ماحولیاتی تحفظ کا انتظام کرنا، اور مہلک وبائی امراض جیسے بین الاقوامی مسائل سے نمٹنا بھی ملکی سلامتی کی تعریف میں آتا ہے۔ یہ تمام مسائل حالیہ برسوں میں عالمی چیلنجوں میں سرفہرست رہے ہیں، اور عظیم طاقتوں کی مسابقت اکثر دنیا کو درپیش گہرے مسائل کے لیے ایک غیر معمولی خلفشار کا باعث بن رہی ہے۔ بلاشبہ یہ تمام مسائل اس بات کے متقاضی ہیں کہ عالمی نظام کی درستی کے لیے تمام عالمی طاقتیں اپنی دشمنیوں کو محدود کر کے عالمی سطح پر باہمی تعاون کا مظاہرہ کریں۔

پہلی سرد جنگ نے یہ ثابت کیا کہ کس طرح، مسابقت کے حصول میں، جمہوریتیں اپنے آپ کو ایک جنون میں مبتلا کر لیتی ہیں، غیر لبرل پالیسیوں میں مشغول ہو جاتی ہیں، دفاع کے لیے کسی بھی معقول ضرورت سے ہٹ کر سکیورٹی اداروں کو ''ملٹرائز'' کر سکتی ہیں، متوازن اقتصادی ترقی کے مشن کو بھول جاتی ہیں، اور عالمی نظام کے خصوصی تصورات کا پرچار کرتی ہیں۔ بھارت کو چاہیے کہ وہ تاریخ کو اپنے آپ کو دہرانے کا موقع نہ دے، خاص طور ایک ایسے وقت پر جب کہ اسے اپنی تہذیب، معیشت اور معاشرے کی بحالی کے لیے ابھی بہت طویل سفر طے کرنا ہے۔

بڑی طاقتوں کے درمیان کچھ حد تک جغرافیائی سیاسی مسابقت ناگزیر ہے، اور اس کے امکان تب بڑھ جاتے ہیں اگر دونوں طاقتیں پڑوسی بھی ہوں۔ لیکن اس مسابقت اور مقابلے بازی کی شدت ہمیشہ فریقین ہی طے کرتے ہیں۔ انیسویں صدی میں اینگلو-روسی دشمنی، بیسویں صدی کے پہلے نصف میں برطانیہ جرمنی دشمنی، امریکا سوویت جدوجہد، اور اثر ورسوخ اور طاقت کے حصول کے لیے متعدد دیگر علاقائی رقابتوں میں مختلف قسم کے مقابلوں کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ کچھ شدید طور پر متشدد تھے، کچھ زیادہ پیچیدہ اور لڑائی سے اپنے آپ کو روکے ہوئے تھے۔ بھارت اور چین کی دشمنی کچھ وجوہات کی وجہ سے ان کے خون میں شامل ہے۔ دونوں پرانی قابل فخر تہذیبیں ہیں، پیچیدہ جغرافیائی سیاست کی تاریخ کے ساتھ پڑوسی بھی ہیں، خاص طور پر ہمالیہ کے سرحدی علاقوں میں دونوں کے ذیلی علاقہ جات میں مستقل مسائل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں طاقتیں اپنے آپ کو خطے کے ''پولیس مین'' کے طور پر بھی دیکھتی ہیں۔

تاہم ان سب کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دونوں طاقتیں تصادم کی طرف بڑھیں۔ تنازع سرحد یقیناً ایک ایسا مسئلہ ہے، جس پر اعلیٰ سطح کی سیاسی اور فوجی توجہ اور فریقین کو انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ لداخ میں جاری تعطل نے ان بہت سے مفروضوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے، جس پر دونوں فریقین توے کی دہائی سے امن برقرار رکھنے کے لیے انحصار کرتے تھے۔ امن وسکون کی بحالی کے لیے دونوں فریقوں کو چاہیے کہ اپنی سلامتی کے بنیادی مفادات کو خطرے میں ڈالے بغیر امن وسلامتی کے حصول کے لیے کوشاں رہیں۔ تاہم اس توازن کو حاصل کرنے کے لیے ابھی کافی وقت درکار ہوگا۔

بھارتی پالیسی سازوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ چین کا اصل مخالف اور محاذ ہمیشہ اس کی مشرقی سمندری سرحدوں پر رہے گا۔ اپنے تمام داخلی مسائل کے باوجود، امریکا ایک بڑی طاقت ہے۔ اس نے گزشتہ صدی میں چین کے مشرقی پڑوسیوں کو بحرالکاہل میں سلامتی کی ضمانت دی اور بحرالکاہل کی سکیورٹی کے حوالے سے اپنی شناخت بنائی ہے۔ امریکا اور چین کے تعلقات مستقبل میں بھی پیچیدہ ہی رہیں گے، بھارت کو چاہیے کہ وہ درمیانی راستہ تلاش کرے۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ تنازعات سے فائدہ اٹھایا جائے نہ کہ خود اس کا حصہ بنا جائے۔ خاص طور پر ایشیا ان تنازعات کا شاید آنے والے عرصے میں بھی مرکز ہی رہے گا، اس لیے بھارت کو ان حالات کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی حکمت عملی بنانی چاہیے۔

مغرب میں کچھ لوگ چین سے ٹکراؤ کے لیے بھارت کا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ چین کے خلاف ان ممالک کی اپنی پالیسی تضادات سے بھری ہوئی ہے اور وقتاً فوقتاً

باقی صفحہ نمبر ۲

آلودگی سے کراہتے سمندر

تیزی سے بڑھتی ہوئی آلودگی کسی ایک ملک یا خطے کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیا نہیں جارہا۔ ترقی یافتہ ممالک نے مثالی نوعیت کے اقدامات کے ذریعے شہریوں کو پابند کیا ہے کہ خود بھی آلودگی سے بچیں اور ماحول کو بھی خراب ہونے سے بچائیں۔ ترقی پذیر دنیا میں اس حوالے سے شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے مگر پس ماندہ ممالک میں اس حوالے سے اب تک کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ آلودگی کو پس ماندہ ممالک کے باشندے کوئی مسئلہ سمجھتے ہی نہیں۔ ان ممالک میں ہر طرح کی اور ہر سطح کی آلودگی پائی جاتی ہے۔ کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں جلانے کا رواج اب تک دم نہیں توڑ رہا۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا دھواں دور تک پھیلتا ہے اور فضا کو خطرناک حد تک نقصان پہنچاتا ہے۔ صفائی کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ نکاسیٔ آب کا نظام ناقص ہو تو ماحول کی آلودگی خطرناک حد تک بڑھتی ہے۔ پس ماندہ ممالک میں چھوٹے بڑے کارخانے اور گھریلو صنعتی یونٹ بڑے پیمانے پر مُضِر مادّے خارج کرتے ہیں اور یہ صنعتی کچرا براہِ راست ندیوں اور دریاؤں کے ذریعے سمندروں میں جا گرتا ہے۔ اس حوالے سے غیر معمولی اقدامات کی ضرورت ہے تاکہ زمین کے ساتھ ساتھ سمندروں میں بھی حیاتیاتی تنوّع برقرار رکھا جاسکے۔

....

نالوں، ندیوں اور دریاؤں کے ذریعے ہر سال کروڑوں ٹن کچرا سمندر برد ہو رہا ہے۔ اس میں پلاسٹک کی بنی ہوئی اشیا پر مبنی کچرا ۲۷ لاکھ میٹرک ٹن سے زیادہ ہے۔ اتنی بڑی مقدار میں سمندروں میں گرنے والا پلاسٹک کا کچرا آبی حیات کے لیے انتہائی نوعیت کے خطرات پیدا کر رہا ہے۔ شہری علاقوں سے نکلنے والی چھوٹی ندیاں زیادہ آلودہ ہیں کیونکہ اُن میں صنعتی کچرا بڑے پیمانے پر گرتا ہے۔ سمندروں میں گرنے والا ۸۰ فیصد پلاسٹک کچرا کم و بیش ایک ہزار چھوٹی بڑی ندیوں کے ذریعے آتا ہے۔ یہ دنیا بھر کی ندیوں کا صرف ایک فیصد ہے۔ باقی ۲۰ فیصد پلاسٹک کچرا ۳۰ فیصد ندی نالوں کے ذریعے سمندر میں گرتا ہے۔

ماحول میں پائی جانے والی آلودگی پر نظر رکھنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ اوسطاً ہر منٹ ایک ٹرک جتنا پلاسٹک کچرا سمندروں میں گر رہا ہے۔ دوسرے بہت سے خطرناک کیمیکلز اور دھاتی اجزا بھی سمندروں اور آبی حیات کو بے حال کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ سمندوں میں گرنے والا پلاسٹک سڑتا گلتا نہیں یعنی جوں کا توں پڑا رہتا ہے اور سمندروں کی صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ پلاسٹک، کیمیکلز اور دھاتوں کے باعث سمندروں کا درجۂ حرارت بھی متاثر ہو رہا ہے، اُن میں غذائیت بخش اجزا کی کمی واقع ہو رہی ہے اور اُن میں آکسیجن کی سطح بھی گرتی جارہی ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ صرف بحرِ ہند میں برِصغیر پاک و ہند اور اِن سے ملحق ممالک سے ہر سال کروڑوں ٹن کیمیکلز، دھاتی اجزا اور دیگر مضر اشیا شامل ہوتی ہیں۔ بحرِ ہند سمیت تمام بڑے سمندر شدید نوعیت کی آلودگی سے کراہ رہے ہیں مگر اُن کی پکار کوئی نہیں سُن رہا۔ صنعتی کچرے اور دیگر مضر اشیا سے آبی حیات پر شدید منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ مچھلیاں اور دیگر آبی جاندار پلاسٹک اور دیگر مضر اشیا کو خوراک سمجھ کر نگل لیتے ہیں اور پھر اِن مضر اشیا سے اُن کی جان بھی چلی جاتی ہے۔ وھیل، کچھوے اور دیگر سمندری مخلوق شدید خطرات سے دوچار ہے۔

مختلف شواہد کی روشنی میں ماہرین اس بات کو اب ثابت کر چکے ہیں کہ پلاسٹک میں موجود کیمیکلز اور دیگر مضر دھاتی اجزا کھانے والے سمندری جاندار انسانی حیات پر بھی شدید منفی اثرات مرتب کر رہے ہیں کیونکہ دنیا بھر میں تین ارب سے زائد افراد کم و بیش باقاعدگی سے مچھلی اور دیگر سمندری جانداروں کو خوراک کا حصہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان جانداروں کے جسم میں داخل ہونے والے کیمیکلز اِنہیں کھانے والے انسانوں تک منتقل ہوتے ہیں۔ سمندروں میں بڑے حجم کے شکاری جانداروں میں مضر اجزا کا بڑھتا ہوا تناسب دنیا بھر میں تشویش کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے ماحول میں مضر کیمیکلز اور اُن سے جُڑے ہوئے اجزا کا تناسب پریشان کن حد تک بڑھتا جارہا ہے۔

سمندری امور سے متعلق تحقیق کرنے والے ماہرین کو حال ہی میں ناروے میں وھیل کے اندر انتہائی مضر اجزا ملے ہیں۔ ''انوائرنمینٹل ٹاکسیکولوجی اینڈ کیمسٹری'' جریدے میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ہر آٹھ میں سے سات وھیلز کے جسم میں انتہائی خطرناک اور ممنوع کیمیکل پالیکلورائنیٹیڈ بائیفنائل نامی پایا گیا ہے۔ ماہرین کو کِلر وھیلز میں انسانی صحت کے لیے بھی انتہائی خطرناک قرار پانے والا کیمیائی مادہ ''پرفلواوروالکائن سبسٹینس'' (پی ایف اے ایس) ملا ہے۔ ابھی تک یہ بات تو حتمی طور پر معلوم نہیں کی جاسکی ہے کہ سمندروں کے ممالیہ جانداروں کو یہ کیمیائی اجزا کس حد تک نقصان پہنچاتے ہیں تاہم اِتنا ضرور ہے کہ آبی حیات کی صحت بُری طرح متاثر ہو رہی ہے اور اِس کا اثر اُنہیں خوراک کا حصہ بنانے والے انسانوں پر بھی مرتب ہو رہا ہے۔ کیمیائی اجزا والی اشیا نگلنے سے آبی جانداروں میں تولیدی صلاحیت بھی متاثر ہو رہی ہے اور اُن میں ہارمونز کا توازن بھی بگڑ رہا ہے۔ ماہرین کو کِلر وھیلز میں برامینیٹیڈ فلیم ریٹارڈنٹس بھی ملے ہیں جو اُن سے اُن کے بچوں میں بھی منتقل ہو رہے ہیں۔

اسپینش نیشنل ریسرچ کونسل سے وابستہ سائنس دان اِتھل اجارت کی سربراہی میں کی جانے والی ایک اسٹڈی کے ذریعے کچھوؤں کے پیٹ میں بھی شدید مضر اجزا کی موجودگی کا سراغ ملا ہے۔ ساحلوں پر مردہ پائے جانے والے درجنوں کچھوؤں کے جسم کا تجزیہ کرنے سے مضر اجزا کا پتا چلا۔ ماہرین کو پلاسٹک میں ایسے اُنیس اجزا ملے ہیں جو ہارمونز کا توازن برقرار رکھنے والے اینڈوکرائن سسٹم پر بُری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ کچھوے عام طور پر جیلی فش، اسکوائڈ اور سارڈن کھاتے ہیں مگر معلوم ہوا ہے کہ وہ پلاسٹک کی چھوٹی بوتلیں، بوتلوں کے ڈھکن اور پلاسٹک کے دیگر اجزا بھی نگل جاتے ہیں۔

آسٹریلیا میں شائع ہونے والی ایک تحقیقی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۲۰۱۹ء میں ندی نالوں اور دریاؤں کے ذریعے ۱۳ کروڑ ٹن پلاسٹک کچرا سمندروں میں پہنچا۔ پلاسٹک کچرا سمندر تک پہنچانے میں چھوٹے اور درمیانے حجم کے دریاؤں کا کلیدی کردار ہے۔ ۲۰۱۷ء تک ایسے دریاؤں اور ندیوں کی تعداد دس سے بیس تھی مگر اب ان میں پریشان کن حد تک اضافہ ہو چکا ہے۔ نئی تحقیق کے مطابق سمندروں میں ۲۵ فیصد پلاسٹک کچرا ۴۵/۴ چھوٹے دریاؤں اور ندیوں کے ذریعے پہنچتا ہے۔ ۳۶۰ چھوٹی ندیاں ۲۴ فیصد، درمیانے حجم کی

باقی صفحہ نمبر ۱۶

مطلق العنانیت سے بڑھ کر کوئی وبا نہیں!

Michael J. Talmo

دنیا بھر میں صدیوں سے وبائیں پُھوٹتی اور ہلاکت کا بازار گرم کرتی رہی ہیں۔ اِن میں کچھ تو بالکل اصلی تھیں، جیسا کہ چودھویں صدی عیسوی کی طاعون کی وبا تھی۔ اور بعض بالکل بے بنیاد اور جھوٹ پر مبنی بھی تھیں جیسا کہ گزشتہ برس کورونا وائرس کی وبا تھی۔

ایک وبا ایسی ہے جو کسی نہ کسی شکل میں وقتاً فوقتاً رونما ہوتی رہی ہے۔ کبھی اس نے چھوٹے پیمانے پر خرابیاں پھیلائیں اور کبھی بڑے پیمانے پر۔ کبھی اِس نے جنگِ عظیم دوم جیسی بھرپور تباہی پھیلائی اور کبھی کورونا ویکسین جیسی وبائیں آئیں، جن کے نتیجے میں ہوا کچھ زیادہ نہیں اور شور بہت مچایا گیا۔

مطلق العنان حکومتیں جبر و استبداد کے ذریعے کام کرتی ہیں۔ ان کے ادوار میں لوگوں کے سروں پر خون، موت اور بدعنوانی کی تلواریں لٹکی رہتی ہیں۔ آمرانہ و جابرانہ حکومتیں عوام کو حقیقی احترام سے محروم کرکے اُن کی راہ میں کانٹے بچھاتی ہیں۔ اب ویکسی نیشن کے ذریعے مطلق العنان حکومتیں ہم میں جینیاتی تبدیلیاں ممکن بنا کر ہمیں انسان ہونے کے شرف سے بھی محروم کرنے پر تُلی ہوئی ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں اکثریت کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے اور جبر کے ذریعے اپنی بات منوانے کا شوق نہیں ہوتا۔ یہ تو چند ذہنی مریض ہی ہوتے ہیں جو تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے کر پورے معاشرے کو اپنی مرضی کے مطابق ہانکنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہ صرف جبر کے ذریعے ممکن ہے۔ استبدادی ہتھکنڈے اختیار کرکے وہ لوگوں سے اُن کی آزادی چھین لیتے ہیں۔ وہ بھرپور کرپشن پھیلاتے ہیں اور کرپشن ہی کے ذریعے اپنے طرف داروں کی تعداد بڑھانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ مطلق العنانیت کی راہ پر گامزن ہونے والے ذہنی مریض دراصل پورے معاشرے کے لیے سرطان پھیلانے والے خلیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ پورے معاشرے کو کھوکھلا اور تباہ کرکے دم لیتے ہیں۔ انسانی جسم کم و بیش ۳۰ ہزار ارب خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ چند خلیوں میں جب خرابیاں پیدا ہوتی ہیں تو وہ باقی جسم سے مدد لے کر درست ہونے کے بجائے پورے جسم کو تباہ کرنے پر تُل جاتے ہیں۔

ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ معاشرے کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے والوں کا ساتھ دینے والے بھی سامنے آکر اُن سے مل جاتے ہیں۔ مطلق العنان حکمرانوں میں اُن کے لیے بہت کشش ہوتی ہے، جو کسی نہ کسی طور بہت کچھ حاصل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آمرانہ و جابرانہ انداز سے حکومت کرنے والوں کو کہیں نہ کہیں سے ساتھی اور طرف دار مل ہی جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے مطلق العنان حکمرانوں سے مل جانے سے معاشرہ بہت تیزی سے خرابی کی طرف جاتا ہے۔ اچھا خاصا پُرامن معاشرہ دیکھتے ہی دیکھتے خرابیوں کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

سیاسیات کے ماہر ریوڈولف رمیل (۱۹۳۲ء تا ۲۰۱۴ء) نے سیاسیات کو ''ڈیموسائڈ'' (democide) کی اصطلاح یعنی حکومت کے ہاتھوں لوگوں کا قتل کہا۔ رمیل نے حکومت کے ہاتھوں قتلِ عام سے متعلق ۸ ہزار رپورٹس کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بیسویں صدی کے دوران حکومتوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۲۶ کروڑ ۲۰ لاکھ تھی، جو متعلقہ دور میں جنگوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد سے ۶ گنا تھی۔ اور اگر غیر ضروری جنگوں میں مارے جانے والوں کو شمار کیجیے تو معاملہ زیادہ سنگین ٹھہرتا ہے۔

پروفیسر رمیل کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ آمرانہ اور مطلق العنان قسم کی حکومتوں کے تحت زیادہ ہلاکتیں واقع ہوتی ہیں۔ جہاں جوابدہی کا معیاری نظام کام کر رہا ہو وہاں سیاسی تشدد بھی کم ہوتا ہے اور اُس کے نتیجے میں ہونے والی اموات کی تعداد بھی خاصی کم ہوتی ہے۔ حکومت زیادہ طاقتور ہو جائے تو زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ چند افراد میں سیاسی قوت کا مرتکز ہو جانا روئے ارض پر خطرناک ترین معاملہ ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ حکومتیں کس طور عوام کو اپنے جبر و استبداد کے ساتھ چلنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ دوسرے امریکی صدر جان ایڈمز (۱۷۳۴ء تا ۱۸۲۶ء) نے کہا تھا کہ عوام کو نہ تو کسی بھی معاملے میں اتنا ڈرنا چاہیے کہ اپنی آزادی سے محروم ہونے پر آمادہ ہو جائیں اور نہ ہی کسی کی شائستگی سے نفسی طور پر مغلوب ہو جانا چاہیے کیونکہ انتہائی شائستگی محض منافقت اور بُزدلی ہے۔

مطلق العنان حکومتیں اخلاقی سطح پر بدحواسی پھیلا کر اپنے مقاصد حاصل کرتی ہیں۔ ہر حکومت عوام کی بدحواسی کا بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں حکومت کی طاقت بھی بڑھتی ہے اور آمدن بھی۔ لوگ اپنی آزادی سے ہاتھ دھونے اور اپنی روح کو شیطان کے ہاتھ فروخت کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

مطلق العنان حکومتیں مختلف طریقوں سے لوگوں میں بدگمانیاں پروان چڑھا کر ایک دوسرے پر اعتماد مجروح کرتی رہتی ہیں۔ اخلاقی برائیوں کے خلاف چلائی جانے والی تحریکوں کو بھی آمرانہ و جابرانہ حکومت اپنے مفاد میں استعمال کرتی ہیں۔

جابر حکومتیں انصاف کے نام پر انتقام کی ذہنیت کو پروان چڑھاتی ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بُروں سے نجات کے لیے اپنی آزادی کو کسی بھی طور داؤ پر نہیں لگایا جاسکتا۔ آمر و جابر حکومتیں ریاست کے ہر فرد کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں کہ وہ تنِ تنہا کچھ نہیں کرسکتا اور یہ کہ کسی بھی بڑی مثبت تبدیلی کے لیے مل کر کوشش کرنے ہی سے دال گل سکتی ہے۔

اس حوالے سے کیا جانے والا پروپیگنڈا بسا اوقات اتنا طاقتور اور موثر ثابت ہوتا تھا کہ گزرے زمانوں میں لوگ ملک و قوم کی بھلائی کے لیے اپنی اولاد کو بھی دیوتا یا مہنت کے قدموں میں قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے کام حکومتیں ہی کرسکتی ہیں۔ ملک میں حقیقی ترقی و استحکام کے لیے بھرپور نوعیت کا بنیادی ڈھانچا کھڑا کرنا حکومت ہی کے بس کی بات ہے۔ عام آدمی اس گمان میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ خود کچھ نہیں کرسکتا، حکومت سے مدد لیے بغیر چارہ نہیں۔ حکومتیں اِسی ذہنیت کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ کوئی کیا پہنے گا، کیا کھائے گا، کس طور زندگی بسر کرے گا، کس سے ملے گا، کس سے نہیں ملے گا، کیا پڑھے گا، گزر بسر کے لیے کیا کرے گا یہ سب کچھ حکومت کے طے کرنے کا کام نہیں۔ یہ ہر فرد کے اپنے معاملات ہیں جو اُس سے چھینے نہیں جاسکتے۔

فی زمانہ شخصی آزادی کا تصور بہت حد تک دھندلا گیا ہے۔ مغربی معاشرے نے شخصی آزادی کو غیر معمولی قرار دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہاں ہر فرد اپنے وجود کو نمایاں کرنے کی دُھن میں مگن ہوا مگر اب وہ دور لد چکا ہے۔ اجتماعیت کو انفرادیت سے کہیں اہم قرار دینے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔ شخصی شناخت سے کہیں زیادہ اجتماعی شناخت کی اہمیت جتائی جارہی ہے۔ معاشرے کی ہر بات ماننا اور اُس کے رنگ میں رنگ جانا کسی بھی طور آزادی نہیں۔

کورونا کی وبا نے دنیا بھر کی جابر اور مطلق العنان حکومتوں

کونمایاں حدتک بے نقاب کر دیا ہے۔ کورونا کی وبا نے آج دنیا بھر کے لوگوں کو انفرادی حیثیت میں شدید دباؤ کا شکار کر دیا ہے۔ اس ایک وبا کے حوالے سے اتنی متضاد باتیں کہی گئی ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات کو درست مانا جائے اور کس بات کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔ جن لوگوں نے کورونا سے بچاؤ کی ویکسین لگوائی ہے اُنہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ جنہوں نے ویکسین نہیں لگوائی ہے اُن سے بچیں، دور رہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ویکسین کورونا سے بچاؤ کے لیے ہے تو موثر کیوں نہیں اور کیوں کورونا سے نہیں بچاسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ کورونا نام کی کوئی حقیقی وبا تھی، نہ ہے۔ کوئی ہنگامی حالت نہیں۔ ۲۰۲۰ء میں اموات کی شرح غیر معمولی نہیں رہی۔ اب لوگوں کو اندازہ ہو رہا ہے کہ کورونا کا تو محض نام لیا جارہا ہے، معاملہ کچھ اور ہے۔ ایک جابر عالمی حکومت کے قیام کی کوششیں تیز تر ہوگئی ہیں۔ ایک بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ اگر کورونا سے بچاؤ کی ویکسین میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں تو پھر امریکا میں ہزاروں ڈاکٹر، نرسوں اور پیرامیڈکس نے یہ لگوانے سے صاف انکار کیوں کیا۔ اگر ویکسین آپ ہی کو کورونا سے محفوظ نہیں رکھ سکی تو پھر اُن سے کیا ڈرنا جنہوں نے ویکسین نہیں لگوائی؟

۱۹۸۰ء کے عشرے میں اُس وقت کے امریکی صدر آنجہانی رونالڈ ریگن نے ایسی پالیسیاں کیوں اپنائیں، جن کا بنیادی مقصد لبرل اِزم کو سمیٹنا تھا۔ آج امریکی معاشرہ لبرل سے نیولبرل ہو چکا ہے۔

ایک طرف تو معاشروں میں خرابیوں کا رونا رویا جارہا ہے اور دوسری طرف دولت کو چند ہاتھوں مرتکز رکھنے پر بھی زور دیا جارہا ہے۔ بل گیٹس اور وارن بفیٹ جیسے لوگوں کو بہت ہی بڑے پیمانے پر دولت جمع کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ یہ سب کچھ بالکل غلط ہے۔ جبر اور دباؤ کے ذریعے کی جانے والی حکمرانی کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز رہے تاکہ اُسے کنٹرول کرنے میں زیادہ الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

آج دنیا بھر میں حکمرانی کے لیے جبر کو ناگزیر سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی آزادی سے زیادہ سے زیادہ محروم ہوجائیں اور پھر اُنہیں کنٹرول کرنا زیادہ دشوار نہ رہے۔ بیشتر معاملات میں تصنع عمومی چلن ہوکر رہ گیا ہے۔ چند ممالک کو انتہائی مضبوط بنانے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس حوالے سے عالمی اداروں نے خاصا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت نے کورونا ویکسین کے حوالے سے امتیازی نوعیت کا کردار ادا کیا ہے۔ بڑی اور مضبوط حکومتیں جو کچھ چاہتی تھیں وہ بخوشی کیا گیا ہے تاکہ اُن کے ایجنڈے کی تکمیل ہو۔ کمزور ممالک اور خطوں کو دباکر، دبوچ کر رکھنے کی پالیسی کو خوب عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔

ترقی یافتہ معاشروں کے طاقتور اداروں کو زیادہ سے زیادہ کمانے کی کُھلی چُھوٹ دے دی گئی ہے۔ کوئی انہیں روکنے والا نہیں۔ یہ ادارے اتنے طاقتور ہیں کہ کسی بھی حکومت کو چلتا کرسکتے ہیں اور کسی کو بھی اقتدار سے بہرہ مند کرسکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز رہنے سے دنیا بھر میں غیر معمولی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ انتہائی مالدار افراد اور ادارے اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ تقویت فراہم کرنے کے لیے سیاست دانوں اور بالخصوص حکومتی شخصیات کو خریدنے میں دیر لگاتے ہیں نہ بُخل سے کام لیتے ہیں۔

دنیا کا مفاد اِس امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی بھی حکومت اِتنی طاقتور نہ ہو کہ چھوٹے ممالک سے کھلواڑ کرتے رہیں۔ انتہائی مالدار افراد اور اداروں کے لیے دولت کی حد مقرر کی جانی چاہیے۔ کاروباری ادارے درمیانے حجم کے ہونے چاہئیں۔ سرکاری مشینری کو رشوت دینے کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اس بات کو بھی یقینی بنایا جانا چاہیے کہ کوئی بھی مالدار شخص یا ادارہ کسی سیاست دان یا حکومتی شخصیت کو رشوت نہ دے سکے۔

آج دنیا بھر میں حکومتیں مختلف سطحوں پر جبر و استبداد سے کام لے رہی ہیں۔ مطلق العنانیت کی بنیاد پر تمام معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Tyranny: The deadliest pandemic".
("Global Research". August 9, 2021)

بقیہ: برطانیہ کی قومی سلامتی کے لیے ممکنہ خطرہ

نہیں کرسکتے لہٰذا ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نیشنل سکیورٹی اسٹریٹجک انویسمنٹ فنڈ کے ذریعے اپنے مسائل ان اداروں کے سامنے رکھیں گے، جو عام طور پر نیشنل سکیورٹی کے لیے کام نہیں کرتے۔

ایم آئی سکس کے کام کرنے کے طریقہ کار میں اتنی بڑی تبدیلی یقیناً اس کے مخالفین کی نظر میں بھی ہوگی۔ ایم آئی سکس کی پرائیوٹ سیکٹر کے ساتھ شراکت میں اس کے راز لیک ہونے کا ہمیشہ خطرہ رہے گا۔

لیکن ایم آئی سکس کے پاس اب اس کے علاوہ کوئی چارہ رہ نہیں گیا ہے۔ یہ یقیناً ایک جرأت مندانہ قدم ہے جو اس کے دشمنوں کے لیے کچھ مواقع بھی پیدا کرسکتا ہے۔

(بحوالہ: ''بی بی سی اردو ڈاٹ کام''۔ یکم دسمبر ۲۰۲۱ء)

افغانستان: غلطیوں کے اعادے سے گریز

دھڑوں کو اب تک متحد رکھنے والے عوامل کی بھی آزمائش ہے۔ ۲۰۱۳ء میں ملا عمر کے انتقال کے بعد کوئٹہ شوریٰ اور مشرقی افغانستان کے دور افتادہ علاقوں میں سرگرم طالبان کے درمیان اختلافات نے سر اٹھایا۔ اس کے نتیجے میں طالبان کے دھڑوں کو ایک بار پھر اتحاد کی لڑی میں پرویا گیا۔ ایک طرف حقانی نیٹ ورک تھا جو سخت گیر تھا اور لڑائی جاری رکھنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اعتدال پسند طالبان تھے جو کابل اور اسلام آباد سے بات کرکے معاملات کو درست کرنے کے قائل تھے۔

ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ طالبان کے دھڑے (مشرقی و مغربی افغانستان کے کمانڈر، کوئٹہ شوریٰ اور دوحہ میں قائم سیاسی ونگ) کس طور متحد رہیں گے۔ ویسے ماہرین اور تجزیہ کاروں نے جو اندازے قائم کیے تھے، طالبان کی نئی عسکری و سیاسی مہم اُن سے کہیں زیادہ نظم و ضبط کی حامل رہی ہے۔

اسٹریٹجک اعتبار سے طویل المیعاد منظرنامہ زیادہ تابناک اور امید افزا نہیں۔ امریکا اور نیٹو کے وعدوں پر یقین کرنے والوں کی تعداد اب برائے نام ہے۔ ہم نے اپنے دشمنوں کو پروپیگنڈا کے محاذ پر بھرپور کامیابی یقینی بنانے کے تمام مواقع فراہم کیے ہیں۔ بھارت ایک اہم علاقائی اتحادی سے محروم ہوچکا ہے۔ پاکستان کا خفیہ ادارہ آئی ایس آئی سمجھتا ہے کہ اُس نے ایک بڑی فتح یقینی بنائی ہے۔ پاکستان کے وزیر اعظم عمران خان نے تو یہاں تک کہا کہ طالبان کی فتح کا مطلب یہ ہے کہ افغانستان اب غلامی کی زنجیریں توڑ چکا ہے۔ چین نے کہا ہے کہ وہ طالبان حکومت کے ساتھ مل کر کام کرتا رہے گا۔ وہ میس اینک کے مقام پر تانبے کی کان دوبارہ کھول رہا ہے۔

میں نے ۲۰۰۹ء میں گنڈا مک نامی گاؤں میں قبائلی عمائدین سے ملاقات کی تھی۔ یہی وہ گاؤں ہے جہاں ۱۸۴۲ء میں برطانوی فوجیوں نے افغانوں کو آخری بار رمنہ دینے کی کوشش کی تھی۔ جو کچھ ۲۰۲۱ء میں ہوا اُس سے بارہ سال قبل بھی قبائلیوں نے حالات کی بدلتی ہوئی روش کو محسوس کرلیا تھا، بھانپ لیا تھا۔ ایک بزرگ نے کہا تھا ''تمام امریکی جانتے ہیں کہ اُن کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ صرف اُن کے سیاست دان حقائق کو تسلیم اور قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ امریکیوں کے آخری دن ہیں۔ اب چین کی باری ہے''۔

(کتاب ''ریٹرن آف اے کنگ: دی بیٹل فار افغانستان'' سے اقتباس)

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Repeating the mistakes of past wars in Afghanistan".
("theweek.in". September 12, 2021)

اسلامی اساس پر علوم کی تدوینِ نو

ڈاکٹر محمد رفعت

پچھلی صدی میں اسلامی تحریکات نے معاشرے کی اسلامی خطوط پر تعمیر نو کی دعوت دی۔ تعمیر نو کا ایک اہم جز، علوم کی اسلامی اساس پر تدوین ہے۔ اس پہلو کی طرف سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور سید قطبؒ نے اپنی تحریروں میں توجہ دلائی۔ تقریباً پون صدی کا عرصہ گزر جانے کے بعد اس سمت میں ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر جناب محمد نجات اللہ صدیقی صاحب کا مقالہ ہے۔ مقالے کا عنوان ہے: "Islamization of Knowledge, Reflections on Priorities" (علوم کی اسلامی تدوین-ترجیحات کا جائزہ)

یہ مقالہ امریکی جریدے American Journal of Islamic Social Sciences (جلد ۲۸، شمارہ ۳) میں شائع ہوا تھا۔ محترم مقالہ نگار نے علوم کی اسلامی تدوین کے سلسلے میں پیش کیے گئے تصورات اور اس سمت میں کی جانے والی عملی کوششوں کا جائزہ لیا ہے، خصوصاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں اور اسماعیل فاروقی مرحوم کے پیش کردہ خاکہ پر مقالہ نگار نے گفتگو کی ہے۔ اس مقالے کے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

الف) علوم کی اسلامی تدوین پر گفتگو کرتے ہوئے دو طرح کے کاموں میں فرق کیا جانا چاہیے، گرچہ دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ان میں سے ایک کام موجود علمی سرمائے کا مفید استعمال ہے۔ یہاں اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ معلومات کا استعمال اخلاقی قدروں کے تابع اور اخلاقی حدود کا پابند ہو۔ اس کام کے کرنے کے لیے اخلاقی اقدار کا شعور اور انسانی زندگی سے اُن کے ربط کی دریافت وشناخت ضروری ہے۔ اس کام سے جداگانہ مستقل حیثیت رکھنے والا دوسرا کام یہ ہے کہ موجود علمی سرمائے میں اضافہ کیا جائے، نئی معلومات فراہم کی جائیں اور تخلیقی صلاحیت سے کام لے کر علم کے دائرے کو وسیع کیا جائے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے آزاد فضا درکار ہے، جہاں دماغوں اور ذہنوں کو سوچنے کی اور نئی راہیں تلاش کرنے کی آزادی ہو۔

ب) مندرجہ بالا دونوں کاموں کی اہمیت مسلّم ہونے کے باوجود ان میں سے موخر الذکر کام زیادہ ترجیح کا مستحق ہے۔ لیکن محسوس ہوتا ہے کہ علوم کی اسلامی تدوین کے مجوزین اور داعیان ابھی تک تخلیقی کام کو وہ اہمیت نہیں دے سکے ہیں، جو اسے ملنی چاہیے تھی۔

ج) علم کے دائرے کو وسیع کرنے کا کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے آفاقی ہے، یعنی اس کام کی انجام دہی میں انسانیت کے مختلف گروہوں کا باہمی تعاون ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔ دین اور عقیدے کا اختلاف یا اخلاقی نقطہ نظر کا اختلاف اس تعاون میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔

د) علم کو حصولِ قیادت یا حصولِ اقتدار کا ذریعہ سمجھنا مخلِ نظر ہے۔ علم کا یہ تصور منفی رویوں کو جنم دیتا ہے۔

ہ) یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ انسان کی صلاحیت محدود ہے، وہ سب کچھ نہیں جان سکتا اور انسانی علم کا ہر جز یکساں قطعیت کا حامل نہیں ہوسکتا۔ انسانی معلومات کا ایک بڑا حصہ ظنّی ہوتا ہے اور اس میں ابہام پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قطعیت کا دعویٰ کرنے کے بجائے علم کی جستجو کرنے والوں کے لیے انکسار کا رویہ زیادہ مناسب ہے۔

و) یہ سوال سنجیدہ غور کا مستحق ہے کہ کیا مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ دنیا کی امامت کریں، اس پر غلبہ حاصل کریں اور دنیا کا نقشہ اسلام کے مطابق بدلیں۔ (طریق کار کی گفتگو یہاں نہیں ہو رہی ہے بلکہ سوال خود مقصد و منزل کی تعیین سے متعلق ہے۔ طریق کار کے پرامن ہونے کے بارے میں اطمینان کے باوجود خود مقصد کے بارے میں یہ سوال باقی رہتا ہے)

ز) ضرورت ایک ایسے علم کی دریافت کی ہے، جو وقت کے ساتھ بدلتی ضرورتوں کو پورا کرسکے، جس کا مفید استعمال کیا جائے اور جو روحانی اساس پر استوار اخلاقی نقطہ نظر کی رہنمائی سے فیض یاب ہو۔

پورا مقالہ دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ علوم کی اسلامی تدوین کی تحریک، موجودہ مرحلے سے کس طرح آگے بڑھے، اس سلسلے میں عملی مسائل اور اقدامات پر گفتگو مقالے کے آخری حصے میں کی گئی ہے، خصوصاً سماجی علوم میں پیش رفت کے سیاق میں۔ لیکن اس وقت مندرجہ بالا نکات میں سے چند سے ہی تعرض کیا جاسکے گا۔

تخلیقیت:

ترجیحات کی ترتیب کے بارے میں محترم مقالہ نگار کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ علمی سرمائے میں اضافے کا کام ترجیحِ اول کی حیثیت رکھتا ہے اور موجودہ معلومات کے مفید استعمال کی اہمیت، اس کے بعد ہے۔ علوم کی اسلامی تدوین کی تحریک اس ترتیب کو کیوں ملحوظ نہیں رکھ سکی؟ یہ سوال قابلِ غور ہے۔ بظاہر اس کی تین وجوہات سمجھ میں آتی ہیں:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ علمی سرمائے میں اضافہ کا کام نسبتاً مشکل ہے۔ نئی راہیں تلاش کرنا اور نئے زاویوں سے سوچنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کام کے لیے فضا سازگار کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ عموماً مسلم ممالک کے اندر آزادی کا ماحول نہیں پایا گیا ہے۔ اس صورتحال کا اثر مسلمانوں کے علمی اداروں کی فضا پر بھی پڑا ہے۔ تخلیقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی نہ ہونا، تخلیقی عمل میں بڑی رکاوٹ ہے۔

دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ علوم کی اسلامی تدوین کے ابتدائی داعیوں اور بعد میں اس کام کی طرف توجہ دلانے والوں کے ذوق و مزاج میں ایک اہم فرق موجود ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسلامی اساس پر علم کے ارتقا کی جانب دعوت دی۔ محترم موصوف کی اس دعوت کا سیاق، اسلامی تحریک ہے، جو ہدایتِ الٰہی کے مطابق انسانی زندگی کی تعمیر نو کی طرف بلاتی ہے۔ اس سیاق میں علوم کی اسلامی تدوین کا کام ایک زندہ عمل بن جاتا ہے جو انسانی زندگی سے مربوط ہے۔ بعد کے مفکرین مثلاً اسماعیل فاروقی کی تحریروں میں گفتگو کا طرز اکثر کتابی (اکیڈمک) نوعیت کا ہے، جہاں زندگی سے ربط کو زیر بحث تو لایا گیا ہے مگر محض (مسلمانوں یا انسانوں کے) مسائل کے حوالے سے۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ کے افکار میں علوم کی نئی جہت کی تلاش کی طرف واضح اشارے نظر آتے ہیں، جبکہ فاروقی کے خاکے میں مرکزی مقام موجود علم کے جائزے اور اس کی ترتیب نو کو حاصل ہے۔ (خواہ یہ علم مسلمانوں کے ماضی کے علمی سرمائے سے ماخوذ ہو یا حال اور ماضی قریب کے مغربی مفکرین سے حاصل کیا گیا ہو۔) اس فرق کی بنا پر مولانا مودودیؒ کے اندازِ فکر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس موضوع پر اُن کی تحریریں مختصر ہونے کے باوجود، علوم کی اسلامی تدوین کی تحریک کو ترجیحات کی صحیح ترتیب قائم کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔

موجودہ صورتحال کی ایک تیسری وجہ بھی محسوس ہوتی ہے۔ علوم کی اسلامی تدوین کی موجودہ تحریک نے (جو ایک تہائی صدی سے زیادہ عرصے سے موجود ہے) نتائج کے جلد حصول کی طرف توجہ دی چنانچہ اس کام کے اُن تقاضوں کی طرف اُن (داعیوں) کی طبیعت مائل نہیں ہوئی، جو دیر طلب تھے۔ فاروقی نے اپنا مشہور بارہ نکاتی خاکہ پیش کیا، جس میں ترتیب کے ساتھ ان اقدامات کی نشاندہی کی گئی جن کے ذریعے علوم کی تدوین کا کام انجام پاسکتا تھا۔ ان اقدامات میں آخری قدم

نصابی کتب کی تیاری کا تھا۔ اس پورے اندازِ فکر میں عجلت پسندی جھلکتی ہے۔ سوچا یہ گیا کہ ایک مرتبہ نصابی کتب مرتب ہوجائیں تو گویا تدوینِ علوم کا کام مکمل ہوجائے گا اور اس کے بعد محض ان کتابوں کا پڑھنا پڑھانا کافی ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نئے خطوط پر علمی ارتقا پیشِ نظر ہو تو آدمی کے ذہن میں آغازِ کار کے طور پر نصابی کتب تیار کرنے کا خیال نہیں آئے گا بلکہ وہ تحقیقی سرگرمیوں پر توجہ کرے گا۔ بہرصورت اب ماضی کے تجربات کی مدد لیتے ہوئے ترجیحات کی دُرستی ضروری ہے۔ ایسی تحقیقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے، جو علمی ارتقا اور علمی سرمائے میں اضافے کی راہیں کھول سکیں۔ علم کا درست اور مفید استعمال اپنی جگہ ضروری ہے لیکن تحقیقی اسپرٹ سے عبارت تحقیقی سرگرمی زیادہ ضروری ہے۔

آفاقیت:

علوم کا مغربی نقطۂ نظر آفاقی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ مغربی دنیا کے جدید دور میں مشاہدے، تجربے اور اُن پر مبنی عقلی استدلال کو درست علمی طریق کار قرار دیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ علم و تحقیق کا یہ طریقہ طبعی علوم اور انسانی علوم، دونوں میں یکساں کارآمد اور درست ہے۔ اس طریقِ کار کے ساتھ چند مفروضات کو بھی مغربی علمی دنیا میں اساسی حیثیت دی گئی، گرچہ عموماً ان مفروضات کو صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا جاتا۔ مثلاً یہ خیال کہ حقیقت بس اتنی اور ویسی ہی ہے جیسی نظر آتی ہے۔ (بالفاظِ دیگر عالمِ غیب کا کوئی وجود نہیں ہے) یا یہ مفروضہ کہ طبعی دنیا، بعض قوانینِ طبعی کے تحت خود بخود کام کررہی ہے۔ اس میں ہونے والے واقعات اور اس میں نظر آنے والے مظاہر کے پیچھے کسی خالق اور رب کی حکمت و ربوبیت کارفرما نہیں ہے۔ ان مفروضات کے علاوہ جہاں تک انسانی سماج میں مطلوب اقدار کا معاملہ ہے، مغربی دنیا نے اپنے ذوق و مزاج اور رجحان کے مطابق (جو تاریخی عوامل کے نتیجے میں تشکیل پایا تھا) انسانی سماج کے لیے بعض رویّوں کو پسندیدہ قرار دیا اور معاشرے میں اُن کو رائج کرنے کی سعی کی۔ مثلاً انفرادی معاملات میں فرد کی مطلق آزادی، عورت اور مرد کے دائرہ کار کی یکسانیت اور معاشی سرگرمیوں میں ریاست کی کم سے کم مداخلت۔ اسی طرح سیاسی زندگی میں عوام کی حاکمیت اور مذہب و ریاست کی علیحدگی کو اصول کے طور پر اختیار کیا گیا۔ مغربی دنیا کی عمومی رائے یہ ہے کہ علمی تحقیق کا مغربی طریقِ کار...... زندگی اور کائنات کی حقیقت کے بارے میں اس کے مفروضات اور انسانی طرزِ عمل کے سلسلے میں مطلوب و نامطلوب کے مغربی پیمانے...... یہ سب آفاقی نوعیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ساری انسانیت کو چاہیے کہ انھیں اختیار کرے۔ ایسا کرنا مغرب کے نزدیک دانش مندی اور روشن خیالی کی علامت ہے اور دورِ جدید کے تقاضوں کا صحیح جواب ہے۔ اس کے برعکس مغربی علمی تصورات اور پیمانوں کو اختیار نہ کرنا تاریک خیالی کی دلیل ہے اور ایسا طرز اختیار کرنے والے زمانے کے تیز رفتار سفر میں پچھڑ جائیں گے اور ترقی نہیں کرسکیں گے۔

آفاقیت کا ہر دعویٰ (صحیح ہو یا غلط) اپنے اندر بڑی کشش رکھتا ہے، اس لیے کہ انسان کی فطرت آفاقی واقع ہوئی ہے۔ مختلف گوشوں سے یہ بات کہی تو ضرور گئی ہے کہ انسانیت کے مختلف گروہوں اور قوموں کے لیے حق و صداقت کے الگ الگ معیارات ہوسکتے ہیں اور ان سب مختلف معیارات کو یکساں اعتبار سے موزوں و درست قرار دیا جانا چاہیے۔ [اس خیال کو Relativism (اضافیت) کہا جاسکتا ہے] لیکن معیارات کے سیاق میں اضافیت کے اس نقطہ نظر کی کوئی مضبوط دلیل موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ خیال انسانی وجدان سے بھی ٹکراتا ہے، اس لیے کہ انسانوں کی حس ہمیشہ سے غلط اور صحیح میں امتیاز کے اور ردو قبول کے پیمانوں کو آفاقی سمجھتی آئی ہے اور اب بھی ایسا ہی سمجھتی ہے۔ تاریخ کے دوران مختلف گروہوں کی سرگرمیوں کا جائزہ اور تجربات سے سیکھنے اور سبق حاصل کرنے کا سارا کام جانچ کے پیمانوں کو آفاقی تسلیم کرنے کے بعد ہی انجام پاسکتا ہے۔

آفاقیت کی جانب اس رجحان کی روشنی میں محترم مقالہ نگار کے اس خیال سے اتفاق کیا جانا چاہیے کہ علم کے دائرے میں توسیع کا عمل، آفاقی نوعیت رکھتا ہے، چنانچہ اس کام کو امتِ مسلمہ تک محدود سمجھنے یا محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تحقیق اور علمی جستجو کے عمل میں سارے انسانوں کی شرکت ہونی چاہیے۔ لیکن تحقیق اور دریافت کی کاوشوں کی آفاقیت تسلیم کرنے کے ساتھ، دوسری جانب یہ حقیقت بھی تسلیم کی جانی چاہیے کہ معلومات کی فراہمی، تحقیق و جستجو اور حاصل شدہ معلومات کی ترتیب و تدوین کا سارا کام، بہرحال، کسی نہ کسی تصورِ کائنات کے تحت ہی انجام پاتا ہے۔ مزید برآں، جہاں تک اس دائرۂ علم کا تعلق ہے، جس کو انسانی علوم سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہاں علمی سرگرمیوں کو منظّم کرنے کے لیے تصورِ کائنات کے علاوہ اخلاقی قدروں کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ چنانچہ اصل سوال یہ ہے کہ وہ آفاقی تصورِ کائنات کیا ہے جس پر تحقیق کرنے والے باہم اتفاق کرسکیں اور وہ اقدار کون سی ہیں، جن کو وہ سب تسلیم کرلیں۔

مندرجہ بالا سوال مسلمانوں کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ جہاں تک تصورِ کائنات کا تعلق ہے (جس میں تصورِ انسان شامل ہے) ہمارے سامنے دو تصورات آتے ہیں۔ ایک مغرب کا غالب تصور ہے جو پچھلی چار صدیوں کے دوران منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ تصورِ کائنات و انسان، مادیت اور الحاد سے متاثر ہے۔ دوسرا قابلِ توجہ تصور، توحید پر مبنی تصورِ کائنات ہے، جس کی جھلکیاں اقوامِ عالم کے مذہبی لٹریچر میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس کا واضح اور مربوط بیان اسلام نے پیش کیا ہے۔ ان دو تصورات کے علاوہ کوئی تیسرا قابلِ لحاظ نظریہ موجود نہیں ہے، جو کائنات اور انسان سے متعلق بحث کرتا ہو۔ (مشرکانہ تصورات کو ان کے قائلین نے عموماً بعض مراسم تک محدود رکھا ہے اور علمی سرگرمیوں میں وہ مادی تصورِ کائنات کے ہی قائل نظر آتے ہیں)۔ مادیت اور الحاد سے متاثر مغربی تصورِ کائنات ہو یا اسلام کا پیش کردہ توحید پر مبنی تصورِ کائنات، دونوں آفاقیت کے مدعی ہیں اور اپنی صداقت کے دعوے کو انسانیت کے کسی خاص گروہ تک محدود نہیں رکھتے (یہ الگ بات ہے کہ بہت سے مسلمان، تصورِ توحید کی اس آفاقیت کو فراموش کر بیٹھے ہیں)۔

توحید کی آفاقیت کے ادراک سے ایک اہم نتیجہ نکلتا ہے، وہ یہ کہ انسانوں کے مختلف گروہ اگر اسلام کو بحیثیت دین قبول نہ کریں تب بھی اُن کے لیے یہ ممکن ہے کہ علمی تحقیق اور معلومات کی ترتیب کے لیے توحید کو اساس قرار دیں اور توحید سے ہم آہنگ تصورِ انسان کو اپنائیں۔ یہی وہ رویہ ہے جس کی طرف مسلمان، انسانوں کو بلا سکتے ہیں۔ انسان کے متعلق اسلام بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی اشیا کو انسان کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ اشیا سے انسان کے اس تعلق کو قرآنِ مجید، تسخیر سے تعبیر کرتا ہے۔ تسخیر کا تقاضا ہے کہ انسان، کائنات کی اشیا کا مفید استعمال کرے اور اس استعمال میں کوئی جھجک محسوس نہ کرے۔ اس لیے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ سب اشیا اس کے لیے جائز ہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

''اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ، پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے کہو، کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کردیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے اللہ کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کردیں؟ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں، اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں، اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں''۔ (الاعراف: ۳۱-۳۲)

''کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی

ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں''۔ (لقمان: ۲۰)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تا کہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو۔ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا، سب کچھ اپنے پاس سے اس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں''۔ (الجاثیہ: ۱۲-۱۳)

تسخیر کا مفہوم بیان کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں: ''کسی چیز کو کسی کے لیے مسخر کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ وہ چیز اُس کے تابع کر دی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے اور جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔ دوسری یہ کہ اس چیز کو ایسے ضابطے کا پابند کر دیا جائے جس کی بدولت اس شخص کے لیے نافع ہو جائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے۔

زمین وآسمان کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ایک ہی معنی میں مسخر نہیں کر دیا ہے، بلکہ بعض چیزیں پہلے معنی میں مسخر کی ہیں اور بعض دوسرے معنی میں۔ مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات، مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں پہلے معنی میں ہمارے لیے مسخر ہیں اور چاند، سورج وغیرہ دوسرے معنی میں''۔ (تفہیم القرآن، سورہ لقمان، حاشیہ ۳۵)

توحید، خلافت، امانت اور تسخیر پر مبنی تصورِ کائنات وانسان، ایک ایسا آفاقی نظریہ فراہم کرتا ہے جو علم وتحقیق کی درست اساس ہے۔ مادیت اور الحاد سے متاثر مغربی تصورِ کائنات کے بجائے، توحید پر مبنی اِس تصور کو تمام انسان اپنا سکتے ہیں اور اس بنیاد پر علمی سرگرمیوں کو منظم کر سکتے ہیں۔ اسلام سے باقاعدہ وابستگی، اس کے لیے لازمی شرط نہیں ہے۔ اسلام نے اخلاقی قدروں کے ضمن میں اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرنے کے لیے معروف اور منکر کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ یہ اصطلاحیں آفاقی مفہوم کی حامل ہیں۔ جو افراد اسلام کو بحیثیت دین قبول نہ کریں، ان کو بھی معروف کی طرف بلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور اسی طرح اُن کو منکر سے روکنا بھی۔ چنانچہ معروف اور منکر دو متضاد انسانی رویوں کی جانب اشارہ کرنے والے جامع عنوانات ہیں، جن میں پہلا رویہ فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے، اور دوسرا اس فطرت سے انحراف کا غماز ہے۔ انسانوں میں عقیدے کے اختلاف کے باوجود، اخلاقی اقدار کے سلسلے میں اُن کا متحد الخیال ہونا ممکن ہے اور باہمی تعامل کے لیے ضروری بھی ہے۔ معروف ومنکر کے تصورات اس اتحاد کی بنیاد ہیں۔ انسانی معاشرے کو تباہی اور انتشار سے بچانے کے لیے اخلاقی اقدار کی آفاقیت پر زور دینا ضروری ہے۔

''معروف'' کے معنی بیان کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''معروف کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے، اس سے مراد وہ صحیح طریق کار ہے، جس سے بالعموم انسان واقف ہوتے ہیں، جس کے متعلق ہر وہ شخص، جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو، یہ بول اٹھے کہ بے شک حق اور انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریق عمل ہے''۔ (تفہیم القرآن، سورہ بقرہ، حاشیہ ۱۷۹)

''دعوتِ حق کی کامیابی کا گُر یہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معروف، یعنی اُن سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے، جنھیں بالعموم سارے ہی انسان بھلا جانتے ہیں یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقلِ عام (Common Sense) کافی ہوتی ہے، جو ہر انسان کو حاصل ہے''۔ (ایضاً، سورہ اعراف، حاشیہ ۱۵۰)

معروف کا برعکس مفہوم رکھنے والی اصطلاح منکر ہے۔ منکر کا مفہوم یہ ہے:

''منکر سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے''۔ (ایضاً، سورہ نحل، حاشیہ ۸۹)

مسلمان تخلیقی صلاحیت سے کام لے کر توحید کی اساس پر علمی وتحقیقی سرگرمیوں کو منظم کریں تو علم کے دائرے کو وسیع کرنے میں تمام خدا پرستوں کا تعاون اُن کو حاصل ہوسکتا ہے۔ اساس کی طرح اخلاقی قدریں بھی، انسانیت کے درمیان مشترک ہیں، چنانچہ مطلوب انسانی رویہ وہ ہے جو معروف کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔ اسی طرح منکر ایسا رویہ ہے جو ناپسندیدہ اور نامطلوب ہے۔ اس طرح وہ آفاقی بنیاد فراہم ہو جاتی ہے، جو مغرب کے مادّی نقطۂ نظر کا متبادل بن سکتی ہے۔

امامت، قیادت اور اقتدار

امتِ مسلمہ کے سپرد کیا کام کیا گیا ہے، اس سلسلے میں عموماً اس آیت سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے:

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں (کی ہدایت واصلاح) کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے تو انھی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایمان لانے والے بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں''۔ (آل عمران: ۱۱۰)

اس آیت کی رو سے امتِ مسلمہ اس امر کی پابند ہے کہ انسانوں سے ربط رکھے، ان کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ آیت کے الفاظ عام ہیں، چنانچہ امتِ مسلمہ کو یہ کام ہر حال میں کرنا ہوگا، خواہ اسے حکومت اور اقتدار حاصل ہو یا نہ حاصل ہو۔ البتہ قرآنِ مجید صراحت کے ساتھ اس صورتِ حال کے بارے میں گفتگو، دوسرے مقام پر کرتا ہے، جب اہلِ ایمان کو اقتدار حاصل ہو:

''یہ (اہلِ ایمان) وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ (الحج: ۴۱)

دونوں آیات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، امتِ مسلمہ کا دائمی وظیفہ ہے، اقتدار حاصل ہونے کے بعد بھی اور اُس سے پہلے بھی۔ امت کی یہ دائمی صفت، انسانیت عامہ سے اُس کے دائمی ایجابی ربط کی اہمیت واضح کرتی ہے۔ معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کے کام کو انسانوں کی ''رہنمائی'' کرنے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انسان اس رہنمائی کو قبول کرتے ہیں یا بے اعتنائی برتتے ہیں، ہر صورت میں اس رہنمائی کا فراہم کرنا امت کی ذمہ داری ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ امت کا منصب، انسانیت کے رہنما گروہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے انسانوں کا رہنما بنایا ہے اور اس کو انسانیت کی امامت کا کام سپرد کیا ہے۔ اس اصولی صورتِ حال کی توضیح کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ عملی صورتِ حال کیا ہوسکتی ہے۔

الف) ایک اِمکان یہ ہے کہ خود امت یا اس کے بیش تر افراد یہ بات بھول جائیں کہ انھیں انسانیت کی رہنمائی کرنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں امت انسانوں سے بے تعلق رہے گی اور دنیا میں کوئی تعمیری کردار ادا نہ کر سکے گی۔

ب) دوسرا امکان یہ ہے کہ امت کو اپنا مقام ومنصب یاد ہو، وہ انسانوں کو رہنمائی فراہم کرے، لیکن اس کے مخاطبین بے اعتنائی برتیں اور اس کی رہنمائی سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ اس صورت میں، کم از کم فوری طور پر، انسانوں کے عام رویے کو امت متاثر نہ کر سکے گی۔ البتہ یہ توقع ضرور کی جاسکتی ہے کہ خود امت، راہِ راست پر قائم رہے گی۔

ج) تیسری ممکن صورت یہ ہے کہ انسانیت، امت کی فراہم کردہ رہنمائی کی قدر کرے اور اس کو قبول کرے۔ اس صورت میں یہ کہا جاسکے گا کہ امت کو قیادت حاصل ہوگئی ہے یعنی لوگ امت کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔

مندرجہ بالا تینوں امکانات کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات

سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں کی رہنمائی امت کا لازمی کام ہے۔

قیادت کے حصول کو بذاتِ خود امت کا مقصد قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امت کی فراہم کردہ رہنمائی کو انسان قبول کرلیں تو امت کو قائدانہ پوزیشن حاصل ہوجائے گی۔ اگلا سوال اقتدار اور حکومت سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں قرآنِ مجید بتاتا ہے کہ ایمان اور عملِ صالح سے متصف ہونے کی صورت میں، اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اقتدار عطا کرے گا۔

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ، جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا، جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لیے اُن کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے اور اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں''۔ (النور:۵۵)

آیتِ بالا کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کی موجودہ حالتِ خوف کو حالتِ امن سے بدل دے گا۔'' اس ارشاد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو اقتدار اہلِ ایمان کو حاصل ہو اس کی غرض یہ ہوگی کہ وہ اہلِ کفر کے تسلط سے آزاد ہوجائیں اور بے خوف وخطر، اللہ کی بندگی کریں۔ اقتدار اس لیے نہ ہوگا کہ مسلمان، دوسرے انسانوں پر اپنی آقائی جمائیں۔ کفر اور اہلِ کفر کے تسلط سے مسلمانوں کی آزادی یقیناً مطلوب ہے۔ یہ پہلو سامنے رکھا جائے تو اسلام کے غلبے کے لیے شعوری کوشش کے سلسلے میں کوئی تردد باقی نہیں رہتا۔ علوم کی اسلامی خطوط پر تدوین (Islamization of Knowledge) کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے آخر میں یہ گزارش ضروری ہے کہ یہ اصطلاح پیشِ نظر کام کے لیے موزوں اصطلاح نہیں ہے۔ اسلامائزیشن کے لفظ سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ علم اور معلومات تو موجود ہیں، جو کچھ کرنا ہے وہ محض یہ ہے کہ معلومات کے اس ذخیرے کو اسلام کے قالب میں ڈھالا جائے۔ صورتحال کی یہ تصویر ناقص بھی ہے اور مغالطہ آمیز بھی۔ جیسا کہ محترم مقالہ نگار نے نشاندہی کی ہے، اصل سوال تحقیق کا اور نئی معلومات کی دریافت کا ہے۔ اس تحقیق وکاوش کی اساس اور طریق کار ایسا ہونا چاہیے جو اسلامی مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ شعور، خوداعتمادی اور جرأت کے ساتھ امت کے اہلِ دانش، اس علمی وتحقیقی سفر کا آغاز کریں تو انسانیت کے خیر پسند عناصر کو اپنا ہم سفر بآسانی بنا سکیں گے۔

(بشکریہ: ''زندگی نو'' نئی دہلی۔ شمارہ ستمبر ۲۰۱۴ء)

ہم کب تک ہیں؟

AW Bruna

کیا کوئی چیز، یا کوئی شخص ہمیں سوئچ آف کرسکتا ہے؟ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ کہیں، کوئی وجود محض ایک بٹن دبائے اور جو کچھ بھی دکھائی دے رہا ہے وہ ختم ہوجائے؟ بات بہت عجیب سی لگتی ہے، مگر ماہرین نے اس سوال پر صدیوں غور کیا ہے کہ انسان کی زندگی کیا ہے، حقیقت یا افسانہ۔

کیا ہم اس تصور پر یقین کرسکتے ہیں کہ ہماری دنیا، ہمارا وجود کوئی کمپیوٹر پروگرام ہے، ہولوگرام ہے یا کسی کا خواب ہے؟ کیا آپ کو کبھی کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ جو کچھ بھی ہم دیکھ رہے ہیں وہ کسی نہ کسی اعلیٰ ہستی کا تصور یا خواب ہے؟ کبھی کبھی حالات ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ ہمیں کسی بھی امر پر یقین کرنے کی تحریک نہیں ملتی، اور جی چاہتا ہے کہ ہر چیز پر سے اپنا اعتقاد اٹھا دیں! فلسفیوں اور سائنس دانوں نے اس سوال پر غیر معمولی حد تک غور وخوض کیا ہے کہ ہمارے اردگرد جو کچھ بھی ہے وہ سب کچھ اور خود ہمارا وجود بھی واقعی وجود رکھتا ہے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال سر اٹھائے کہ یہ تمام سوالات بے معنی ہیں، اس لیے کہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، محسوس ہورہا ہے وہی اصلیت ہے، حقیقت ہے۔ اور جو کچھ ہمارے حواس کی حدود میں نہیں وہ درحقیقت نہیں ہے۔ جو لوگ صرف حواس کی حد میں رہ کر بات کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ واقعی ہے۔ اس کے بارے میں یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ بیک وقت ہو بھی سکتا ہے، اور نہیں بھی ہوسکتا!

سب سے پہلے آپ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیجیے کہ جسے ہم حقیقت کہتے ہیں وہ کچھ اتنی زیادہ حقیقی نہیں! حقیقت کے مضافات میں ہم آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فلسفہ اور نظریاتی طبعیات گلے ملتے ہیں، اور جہاں سائنس اور مذہب کسی حد تک اپنی بساط لپیٹ کر سکون کا سانس لیتے ہیں!

اپنے ذہن کی نشست پر اچھی طرح، جم کر بیٹھ جایے۔ حفاظتی بیلٹ کس لیجیے، کیوں کہ جو کچھ بھی اب آپ کے سامنے آنے والا ہے وہ دماغ کی چولیں ہلا دینے والا ہے! یہ بھی ممکن ہے کہ آپ بہت پریشان ہو اُٹھیں اور اپنے وجود اور کائنات کے بارے میں آپ نے جو تصورات یا عقائد قائم کر رکھے ہیں ان کے بارے میں آپ کا عزم متزلزل ہوجائے! جسے ہم حقیقت کی دنیا کہتے ہیں وہ اتنی حقیقی نہیں جتنی ہم سمجھتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم چند دائروں میں رہتے ہوئے سوچتے ہیں۔ جب آپ کسی بھی شے کو زیادہ قریب سے دیکھیں تو اس کی دراڑیں زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ کوئی اداکار سیٹ پر کھڑا ہوا اور دیوار سے ڈر رہا ہو، مگر پھر اُسے اندازہ ہوجائے کہ جسے وہ دیوار سمجھ رہا ہے وہ تو گتے کے ٹکڑے ہیں جنھیں دیوار کی شکل دے دی گئی ہے!

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ سب تو سائنس فکشن کی فلموں میں ہوتا ہے! آپ نے اگر ''دی میٹرکس'' دیکھی ہو تو اندازہ ہوگا کہ جو کچھ ہمیں اپنے اردگرد دکھائی دے رہا ہے وہ اس حد تک موجود نہیں جس حد تک موجود محسوس ہو رہا ہے۔ ''دی میٹرکس'' میں یہی تصور پیش کیا گیا ہے کہ ہم کہنے کو تو موجود ہیں، مگر درحقیقت موجود نہیں ہیں۔ اور ممکنہ طور پر ہماری حیثیت اس سوفٹ ویئر کی سی ہے جسے کسی کمپیوٹر پر چلایا جارہا ہو، اور کمپیوٹر آف کرتے ہی وہ سوفٹ ویئر بھی آف ہوجائے! ہوسکتا ہے کہ ہم سے کہیں زیادہ ذہانت کی حامل کوئی نسل یہ کمپیوٹر گیم چلا رہی ہو، اور پھر وہ اس گیم سے بیزار ہوکر اسے سوئچ آف کردے! یعنی آپ ابھی ہیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے نہیں ہیں!

کہیں یہ سب کچھ پڑھ کر آپ پریشان تو نہیں ہورہے؟ اگر ایسا ہے تو ذہنی طور پر اُلجھنے سے گریز کرتے ہوئے پڑھتے رہیے۔ لیکن یاد رکھیے کہ آنے والی سطور میں آپ جو کچھ پڑھیں گے وہ زندگی کے بارے میں آپ کے نظریے کو شاید مکمل طور پر بدل کر رکھ دے!

''فائن ٹیوننگ'' والی کائنات؟

ہوسکتا ہے بہت سوں کو یہ بات بہت عجیب محسوس ہو مگر سچ تو یہ ہے کہ ہمیں قدم قدم پر محسوس اور غیر محسوس دونوں سطحوں پر، یہ گمان گزرتا ہے کہ ہماری کائنات اس مقام تک خود بہ خود نہیں پہنچی۔ کسی برتر وجود نے اِسے ہمارے لیے fine-tune کیا ہے، حالات کو اس طرح تبدیل کیا ہے کہ روئے ارض پر، کہکشاں میں یا پھر اس کائنات میں کہیں بھی زندگی کا وجود ممکن ہوسکا ہے۔ کیا آپ کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ

اس کائنات کو فعال رکھنے والے طبعی قوانین کسی کے تیار کردہ ہیں؟ کیا ہر معاملے میں ناقابلِ یقین حد تک قطعیت اور موزونیت خود بہ خود پیدا ہو جایا کرتی ہے؟ ہم جس کائنات کا حصہ ہیں اس کے تمام طبعی معاملات انتہائی موزونیت کے حامل ہیں۔ کہیں بھی کوئی ایسی کھوٹ دکھائی نہیں دیتی جس کی موجودگی میں زندگی کے میلے کی رونق برقرار رہ سکتی ہو۔

اسکول میں آپ کو طبعیات کا مضمون شاید خشک ترین محسوس ہوا ہو۔ طبعیات کے قوانین کا مدار کسی نہ کسی معین حقیقت پر ہے۔ مثلاً قوانین تجاذب بھی کسی نہ کسی بنیاد پر قائم ہیں۔ چند ایک امور معین (constant) ہیں۔ ان کی عدم موجودگی کائنات کی تفہیم کو شدید مشکل بنا سکتی ہے۔ قوت تجاذب ہی ذروں کے سینے میں قوت کو متحرک رکھتی ہے۔ برقی مقناطیسی قوت، جو کڑکتی ہوئی بجلی اور کمپیوٹرز کی روح رواں ہے، طبعی قوانین کے تابع ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے سے طے شدہ ان قوتوں کی وہ خاصیت اتنی ہی کیوں ہے جتنی ہے؟ یہ خاصیت کچھ کم یا زیادہ ہوتی تو کیا ہوتا؟

برطانوی ہیئت داں فریڈ ہوکلے ان سائنس دانوں میں سے ہے، جنھوں نے پہلے پہل یہ دریافت کیا کہ کائنات میں جو بھی خاصیت پائی جاتی ہے وہ حادثاتی نوعیت کی نہیں۔ یعنی جو کچھ بھی معین حیثیت سے موجود ہے، وہ خود بہ خود معین نہیں ہو گیا بلکہ اُسے اس مقام تک لایا گیا ہے! اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اگر اپنی موجودہ شکل سے ذرّہ بھر بھی مختلف ہوتا تو کہکشائیں، ستارے، چاند، سورج، زمین کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور ہم بھی نہ ہوتے!

ذرّے (atom) کے سینے میں چُھپی ہوئی قوت کا اندازہ لگایئے۔ اگر یہ خفیف سی بھی زیادہ ہوتی تو کائنات کی تشکیل کے وقت ستاروں کے معرضِ وجود میں آنے کا عمل شاید اگلے ہی سیکنڈ میں ختم ہو جاتا کیوں ستارے اپنی ہی گرمی کے باعث پھٹ جاتے! ہمارا سورج بھی نہ ہوتا۔ اور یوں ہمارے ہونے کی راہ بھی ہموار نہ ہوئی ہوتی۔ اور اگر ذرّات کے سینے میں قوت ذرا بھی کم ہوتی تو یہ مختلف گیسوں کے سالموں کو باہم متحد رکھنے میں کام یاب نہ ہوئے ہوتے۔ اس صورت میں ستارے اپنی توانائی سے محروم ہو جاتے اور ہمارے معرضِ وجود میں یا منصۂ شہود پر آنے کی راہ بھی مسدود ہو جاتی!

یہ تو ہوا ذرّات کی ماہیت کا معاملہ۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں کوئی بھی شے ایک خاص تناسب کے بغیر دکھائی نہیں دیتی۔ برطانوی ہیئت داں سر مارٹن ریز کہتے ہیں ”ہمیں کائنات میں جا بہ جا اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اسے ہمارے لیے fine-tune کیا گیا ہے، یعنی حالات سازگار بنائے گئے ہیں۔ کسی نے تمام امور کو ایک طے شدہ تناسب کے ساتھ پیش کیا ہے۔“ ہمارے ذہنوں کو ہلا دینے والا سوال یہ ہے کہ اگر کائنات میں کوئی بھی معاملہ ایک خاص تناسب اور عدل کے بغیر دکھائی نہیں دیتا، تو ایسا کیوں ہے؟ ہیئت دان اس امر پر متفق ہیں کہ یہ سب کچھ محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تو پھر کون ہے جس نے قوانین طے کیے، اصول مرتب کیے؟

سب سے پہلے تو اس تصور کو اپنایے کہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے صرف وہی حقیقت نہیں ہے۔ آپ کہیں گے کہ کُرسی ایک ٹھوس حقیقت ہے جس پر بیٹھ کر آپ یہ مضمون پڑھ رہے ہیں۔ اسی طور آپ یہ دلیل بھی پیش کر سکتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے کمپیوٹر کی اسکرین ایک حقیقت ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ ہر حقیقت کی پشت پر ایک اور یعنی حقیقی حقیقت موجود ہے جس کی موجودگی میں آپ کی اپنی حقیقت (جو آنکھوں کے سامنے ہے) محض ایک سراب کی سی ہے۔

آپ کسی بھی شے کی حقیقت تک کس طرح پہنچتے ہیں؟ ظاہر ہے اس کا تجزیہ کر کے! تجزیے سے مراد کسی بھی شے کے اجزا کو الگ الگ کر کے ان کا جائزہ لینا، ان پر غور کرنا۔ فرض کیجیے آپ نے کسی بھی چیز کے ٹکڑے کیے تو اس کے سالموں تک پہنچے۔ سالموں کو چیرا تو ذرّات تک پہنچے۔ اگر کسی ذرّے کا دل چیر کر دیکھا تو اس میں مرکزی حصہ ملا جس کے گرد الیکٹران گردش کرتے ہوئے پائے گئے۔ اب اگر آپ ذرّے کے مرکزی حصے کو چیر کر دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے، کہ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب تک آپ نے کیا دیکھا اور کیا پایا؟ کچھ بھی نہیں! بات بہت حیرت انگیز ہے مگر حقیقت پر مبنی ہے کہ ہم جو کچھ بھی دیکھ رہے ہیں، حتمی تجزیے میں اس کی کوئی بھی حیثیت نہیں!

سائنس دان کہتے ہیں کہ ایٹم کا مرکزی حصہ جن ریزوں پر مشتمل ہوتا ہے انھیں انگریزی میں particles کہا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ اس لیے استعمال ہو رہا ہے کہ کوئی اور موزوں لفظ میسر ہی نہیں۔ particle کا لفظ سنتے ہی ہمارے ذہن میں گیند کا تصور ابھرتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کوانٹم فزکس میں گیند جیسی کسی بھی ایسی ٹھوس چیز کا کوئی تصور موجود نہیں جسے آپ دیکھ اور چُھو سکیں۔ quarks، electron اور photon کی مانند "particles" بھی اتنے عجیب و غریب اور ہمارے دائرۂ علم میں موجود کسی بھی دوسری شے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے لیے ہمارے پاس کوئی موزوں لفظ ہے ہی نہیں۔ پارٹیکلز بیک وقت دو مقامات پر ہو سکتے ہیں اور وہ لہر کی صورت سفر کرنے کے علاوہ مادّے کے جُز کے طور پر بھی اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس کا مدار اس بات پر ہے کہ آپ ان کے ساتھ کس نوعیت کا تفاعُل چاہتے ہیں۔ پارٹیکلز اچانک معرضِ وجود میں آ سکتے ہیں، اور پھر اتنی ہی تیزی کے ساتھ غائب بھی ہو سکتے ہیں۔ پارٹیکلز کو گرفت میں لے پانا انتہائی دشوار ہے اور اب تک ناممکن ثابت ہوا ہے۔ بیک وقت یہ بتانا ممکن نہیں کہ اس وقت کوئی پارٹیکل کہاں ہے اور اس کی حرکت کی رفتار کیا ہے!

مگر خیر، پارٹیکل بھی تو کوئی نہ کوئی ”چیز“ ہی ہے نا! یہی سبب ہے کہ طبیعت داں string theory کی طرف لپک رہے ہیں۔ اس نظریے کی رُو سے مادّے کا تصور موہوم سے دائروں کے تصور سے وابستہ ہے۔ یہ دائرے ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ مگر ان کا پیدا کیا ہوا ارتعاش ہماری معلومات کے دائرے میں موجود کسی بھی دوسری چیز کے پیدا کردہ ارتعاش سے یکسر مختلف ہوتا ہے، کیوں یہ ارتعاش دس مختلف سمتوں میں ہوتا ہے! ہم جنھیں پارٹیکلز کہتے ہیں وہ دراصل ان دائروں یعنی strings کے ارتعاش سے پیدا شدہ موسیقی کے سوا کچھ نہیں! یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ مادّہ دراصل کسی اور شے کا اظہار یا کسی عمل کا نتیجہ ہے!

اب ایک بار پھر کائنات کی طرف آیئے۔ ہمارے سروں پر جو ستارے جگمگا رہے ہیں اور ہم جس خلائے بسیط میں پائے جاتے ہیں وہی کائنات ہے۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ کائنات سے پرے کیا ہے؟ ماہرین کے خیال میں یہ تصور اب تک ممکن نہیں۔ ایک لمحہ وہ بھی تھا جب کچھ بھی نہ تھا۔ اور پھر ایک دھماکا ہوا جسے بگ بینگ کہتے ہیں۔ اس کے بعد کائنات کے پھیلنے کا عمل شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ یہ توسیع ”لاشیئیت“ کے سمندر میں موجزن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کائنات سے پرے ہے (یا ہو سکتا ہے) اس کے لیے ہم ”لاشیئیت“ کا لفظ بھی استعمال نہیں کر سکتے۔ ایک تصور یہ ہے کہ دو بڑے بُلبُلے ٹکرائے تو ہماری کائنات معرضِ وجود میں آئی۔ ماہرین اب اس تصور کو اہمیت دے رہے ہیں کہ کائنات ایک نہیں، بلکہ کئی ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ ہماری کائنات میں کئی کائناتیں گڈمڈ کر دی گئی ہوں! اب ایک نظریہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ جسے ہم ”مکانیت“ کہتے ہیں ممکن ہے کہ وہ صرف نظر کا دھوکا ہو۔ ممکن ہے کہ چند جہتیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ”مکانیت“ کا

تصوراتی دھوکا پیدا کر رہی ہوں! اور کسی کائنات کو معرض وجود میں لانا کون سا بڑا مسئلہ ہے؟ ماہرین کہتے ہیں غیر معمولی مقدار میں توانائی لے کر بہت چھوٹی سی جگہ میں اسے جمع کیجیے، ایک بڑا دھماکا ہوگا (جو ایک اور بگ بینگ کہلائے گا) اور یوں ایک نئی کائنات معرض وجود میں آ جائے گی! مگر یہ سب کچھ آپ دیکھ نہیں پائیں گے، کیوں کہ اس کے نتیجے میں جو بُلبُلہ پیدا ہوگا وہ ہمارے بُلبُلے (کائنات) سے بہت مختلف ہوگا۔

اگر آپ اُلجھ رہے ہیں تو کوئی بات نہیں، ٹھہر جایے اور ایک دوسرے پہلو سے معاملات کا جائزہ لیجیے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہماری کائنات کسی اور ذہین تر تہذیب کی تیار کردہ ہو؟ اس پہلو پر غور کرنے سے اندازہ ہو سکے گا کہ ہماری کائنات اس قدر ''سازگار'' کیوں ہے۔

ہم جس مکانیت میں ہیں وہ مکانیت ہے ہی نہیں۔ ہم جس مادے سے بنے ہیں اس کا کوئی وجود نہیں۔ جو کچھ ہے وہ محض نظر کا دھوکا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ کو ایک بات سے ضرور اطمینان ہوتا ہوگا کہ آپ کا وجود تو اصلی ہے! آپ چاہیں تو ایسا سمجھ سکتے ہیں۔ لوگ آپ کو چھو سکتے ہیں، آپ کی بات سن سکتے ہیں، آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا وجود ہے۔ مگر ٹھہریے، زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔

آئینے میں اپنا چہرہ دیکھیے۔ اور دیر تک دیکھتے رہیے۔ آخر کار آپ کو ایسا محسوس ہونے لگے گا کہ آئینے میں جو چہرہ ہے وہ آپ کا ہی نہیں، کسی اور کا بھی ہے۔ آپ کو اپنے آپ کسی اور کے وجود کا گمان ہونے لگے گا۔ یہی معاملہ شعور کا بھی ہے۔ ہمارا ذاتی وجود (self) ہمارے ذہن کی پیداوار ہے۔ دماغ ہمیں جو کچھ دکھاتا اور سناتا ہے وہی کچھ ہمارے شعور کا حصہ بنتا جاتا ہے۔ شعور پانچ حواس اور ان کے ذریعے آنے والی معلومات کے تجزیے سے مل کر بنا ہے۔ شعور خواہ کچھ ہو، درحقیقت اس کا وجود دماغ کا مرہونِ منت ہے۔ یہ معاملہ بھی بہت حد تک سوفٹ ویئر جیسا ہی ہے۔ یعنی کمپیوٹر کی اسکرین پر جو کچھ دکھائی دے رہا ہے وہ ہے تو سہی مگر نہیں ہے، کیوں کہ سب کچھ virtual ہے یعنی حقیقت نہیں بلکہ حقیقت نُما ہے۔ ہم میں سے بیشتر کا عقیدہ ہے کہ روح نام کی کوئی شے بھی ہے۔ مگر طبیعیات دان اور ہیئت دان کہتے ہیں کہ ایسا کچھ نہیں۔ ہم جو کچھ کہتے، کرتے یا محسوس کرتے ہیں وہ صرف ذہن کی کارفرمائی ہے، اور کچھ بھی نہیں! اور تجربات سے یہ بات کسی حد تک ثابت بھی کی جا چکی ہے۔ دماغ کو اگر چھیڑا جائے تو خیالات برہم ہو جاتے ہیں، اور پھر ہمارا self اجنبی سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور یہ کیفیت برقرار رہے تو ہمیں اپنا وجود اپنے ہی جسم سے باہر محسوس ہونے لگتا ہے۔ اسی کو out of body experience کہتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے ''موت کی چوکھٹ تک ہو آنا'' بھی کہتے ہیں۔ موت کا مزا چکھنے کے لیے مرنا ضروری نہیں۔ لیبارٹری میں ایک ایسا ہیلمٹ سر پر لگایے جس میں گھومنے والے مقناطیس لگے ہوں۔ جب یہ مقناطیس حرکت کرتے ہیں تو ذہن کی فعالیت میں اچھا خاصا خلل واقع ہوتا ہے۔ آپ کو یہ محسوس ہونے لگے گا جیسے آپ اپنے جسم کے دائرے میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف احساس ہے، ورنہ آپ تو اپنے جسم کی حدود میں ہی رہتے ہیں! اور اس تجربے سے گزرنے کے لیے مقناطیس والا ہیلمٹ بھی درکار نہیں۔ جہاں زمین کی کشش کم ہو اس مقام پر بھی یہ تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو یہ سب کچھ اس مقام پر بھی ہوتا ہے جہاں آکسیجن کا تناسب کم ہو۔ ذہن کی مخصوص کیفیت آپ کو جسم کی حد سے باہر موجود ہونے کا احساس دلا سکتی ہے۔ مراقبے یا عمیق عبادت کے دوران بھی ایسا ممکن ہے۔ جو لوگ پورے خشوع و خضوع سے حج کا فریضہ ادا کرتے ہیں اُنھیں بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا کرتا ہے۔ ''ذہن سے باہر'' کی اس کیفیت میں آپ کو ایسا محسوس ہو سکتا ہے جیسے آپ سے کسی نے ملاقات کی ہے۔ مثلاً اگر آپ مذہبی اعتقادات رکھتے ہیں تو آپ کسی عظیم مذہبی ہستی سے ملاقات محسوس کریں گے۔ اگر آپ بھوتوں پر یقین رکھتے ہیں تو محسوس ہوگا کہ کسی مردہ شخص کی روح آپ سے ملنے آئی ہے۔ کچھ لوگوں کا ذہن اس کیفیت میں انھیں یہ یقین دلاتا ہے کہ ان سے ملنے کوئی غیر ارضی مخلوق آئی ہے! حقیقت یہ ہے کہ آپ کا ذہن آپ کو جو کچھ دکھا رہا ہوتا ہے، وہی کچھ آپ دیکھ رہے ہوتے ہیں!

لاکھ کوشش کے باوجود سائنس دان اور فلسفی اب تک حقیقت کی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہے ہیں۔ وقت، جہتوں، خلاء اور دوسری بہت سی ''حقیقتیں'' کسی بھی وقت فنا ہو سکتی ہیں، وجود سے محروم ہو سکتی ہیں۔ کائنات میں کب کیا ہو جائے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ جو چند سانسیں ہیں غنیمت ہیں! آپ سوچیں گے کہ جب کسی بھی شے کا کوئی حقیقی وجود ہے ہی نہیں، اور اگر سب کچھ دھوکا یا سراب ہے تو پھر موت یا معدومیت سے کیا ڈرنا؟ ہمارا خواب اچانک ختم ہو جائے تو خواب میں آنے والے ہم سے ناراض ہوتے ہیں؟ نہیں! اگر ہم کمپیوٹر گیم روک دیں تو اس کے کردار ہم سے خفا ہوتے ہیں؟ نہیں، نا! بس تو پھر ہم بھی اگر کسی کا خواب، یا کوئی کمپیوٹر گیم ہیں تو سوئچ آف کیے جانے پر کیوں ناراض ہوں گے؟ مختصراً یہ کہ

چل سکے بس جب تلک ساغر چلے!

(تلخیص و ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Is our reality just somebody's dream?"
("exitmundi.com".

بقیہ: ''مسلم صیہونیت'' ۔ ایک نیا اُبھرتا ہوا فتنہ!

پروٹسٹنٹ عیسائی فادرس، بڑھ چڑھ کر اپنے پیروکاروں کو اسرائیل اور مسمار شدہ ہیکل کی تعمیر نو کی خاطر مہم چلانے اور مالی تعاون کرنے پر اپنے چینلوں سے اکساتے رہتے اور امریکی حکومت کو اسرائیل کا مسلسل ساتھ دینے کے خطبے اور ہدایات دیتے رہتے ہیں۔ کمال اتاترک کی مانند مسلم دنیا کو یہ ایک اور بڑا دھچکا ہے۔

بقیہ: آلودگی سے کراہتے سمندر

۱۲۲ ندیاں ۲۲ فیصد، ۱۸ بڑی ندیاں ۴ فیصد اور مختلف حجم کی ندیاں ۲۶ فیصد پلاسٹک کچرا سمندر برد کرتی ہیں۔ فلپائن کی ۴۸۰۰ ندیوں کے ذریعے ہر سال ساڑھے تین لاکھ میٹرک ٹن پلاسٹک کچرا، چین کی ۱۳۰۰ ندیوں کے ذریعے ۷۰ ہزار میٹرک ٹن پلاسٹک کچرا، بھارت کے ۱۱۰۰ سے زائد دریاؤں اور ندیوں کے ذریعے سوا لاکھ ٹن پلاسٹک کچرا اور ملائیشیا کی ۱۰۷۰ دریاؤں اور ندیوں کے ذریعے ہر سال ۷۳ ہزار میٹرک پلاسٹک کچرا سمندر برد ہوتا ہے۔

ہمارے مجموعی ماحول اور آب و ہوا کے لیے سمندر غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ آب و ہوا کی تبدیلی اور درجۂ حرارت کے بڑھنے سے سمندروں کا توازن بگڑ رہا ہے اور اُن میں بار بار بڑے بڑے طوفان آ رہے ہیں۔ دو تین برس کے دوران آنے والے بڑے سمندری طوفانوں کا اصل سبب درجۂ حرارت کے بلند ہونے کو قرار دیا جا رہا ہے۔ ۲۰۱۸ء سے اب تک بحیرۂ عرب میں مون سُون سے قبل اور اُس کے دوران چھوٹے بڑے طوفان بنتے رہے ہیں۔ یہی حال دوسرے بہت سے سمندروں کا بھی ہے۔ درجۂ حرارت بڑھنے سے گلیشیرز پگھل رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں سمندروں کی سطح بھی بلند ہوتی جا رہی ہے۔ سمندر کی سطح کا بلند ہونا بہت سے مقامات کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ ماہرین اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ سمندروں میں پلاسٹک اور دیگر مضر اشیا کے گرنے کا عمل روکا جائے تا کہ ماحول کو پہنچنے والا نقصان روکا جا سکے۔

(تحقیق و ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

MA'ARIF FEATURE • Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950